قرآن کریم

کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟

حکیم الاسلام امام انقلاب
مولانا عبید اللہ سندھیؒ

حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ

فہرست

مقدمہ: قرآن مجید۔ کتاب برائے انسانیت	ابوالفضل نور احمد	5
مولانا سندھی کا فہم قرآن	امجد علی شاکر	11
پہلا باب: قرآن مجید کی تعلیم کا اثر		**25**
ہرقل کی دعوت کا واقعہ		27
تعلیمِ قرآن کا صحیح طریقہ		29
تعلیمِ قرآن کے بارے میں صحابہ کرامؓ کی آراء اور تعامل		32
قرآن کے غلط طریقۂ تعلیم کے نتائج اور شاہ ولی اللہؒ کی رائے		36
قرآن اور تفسیر کے متعلق شاہ اسماعیل شہیدؒ کی رائے		37
دوسرا باب: مختصر تاریخ تفسیر		**39**
صحیح انداز پر تعلیمِ قرآن سے محرومی کے نتائج		43
توکل کیا ہے؟		44
صبر کا مفہوم		45
چند مثالیں		47
تیسرا باب: قصص القرآن		**54**
حضرت یوسف علیہ السلام		54
قصۂ طالوت و جالوت		56

فرشتے	59
تعددِ ازدواج امریکن مقنن کی نظر میں	60
قصۂ حضرت ابراہیم علیہ السلام	61
قصۂ حضرت نوح علیہ السلام	62
قصۂ حضرت موسیٰ علیہ السلام	63
چوتھا باب: قرآنی تعلیم کو کمزور کرنے کی منظّم سازِش	**67**
پانچواں باب: مذہب۔ مسلمانوں کی ترقی کا زینہ	**70**

باسمہٖ تعالیٰ. رب زدنی علما

مقدمہ

قرآن مجید۔کتاب برائے انسانیت

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کیلئے رہبری و ہدایت کی آخری و دائمی کتاب ہے۔اتمام کتب کیلئے اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا۔ **انا نحن نزلنا الذکر وانالہ لحافظون** ۔جب سے یہ نازل ہوئی ہے تب سے یہ کتاب تمام آنے والے وقتوں میں انسانوں کی تمام اکائیوں اور تمام اقوام عالم کیلئے رہبری و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔قرآن مجید نے انسانیت کے وقار، آزادی، فلاح اور سلامتی کیلئے جو بھی اعلیٰ اصول اور نظریات متعارف کرائے وہ پوری انسانیت اور تمام اقوام عالم کیلئے نجات، آسودگی اور ترقی کے ضامن ثابت ہوئے۔ یہ بات کامل دعویٰ کے ساتھ ثابت ہے کہ ان مقاصد کیلئے جو اصول قرآن مجید نے پیش کر دیئے ہیں اس سے بہتر اور ترقی یافتہ بنیادی اصول انسانیت اور اقوام کو کہیں اور جگہ سے میسر نہیں ہوئے۔قرآن مجید نے زندگی کے تمام شعبوں میں جو اصولی اور اساسی اقدار متعارف کرائے، انسانیت انہی اصولوں کی روشنی میں تفاصیل اور تراکیب سے اپنے وقار، آزادی اور فلاح کی مسلسل منازل طے کرتی گئی۔ جہاں ان تفاصیل میں جتنی زیادہ اقدار کی پاسداری کی گئی اتنی زیادہ ترقی و کامرانی حاصل ہوئی۔

قرآن مجید کی اِن تعلیمات کو جن لوگوں نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ سے سنا ان کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہوا۔ وہ خود پورے کے پورے بدل گئے، انہوں نے اپنے گرد لوگوں کو بدل ڈالا، انہوں نے اپنے سماج کو بدلا اور پھر پوری انسانیت اور تمام اقوام کو اسی انقلاب و تبدیلی سے بہرہ ور کیا۔ یہ اتنی بڑی تبدیلی کہ ایک نئی فکر، نیا نظام اور نیا سماج و نئی معاشرت دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی سب سے بڑی غالب قوت بن گئی۔اس کے پیچھے قرآن مجید کی اطاعت و عمل کے وہ کیا محرکات تھے جس سے انسانی تاریخ کی یہ غیر معمولی تبدیلی و انقلاب

مختصر جماعت نے مختصر وقت میں برپا کر دیا اور اللہ تعالیٰ کی مشیت نے تکمیل دین کا اتمام کر دیا۔

اُس وقت مسلمانوں کے سامنے قرآن مجید ایک گروہی کتاب نہیں تھی بلکہ یہ کتابِ انسانیت تھی۔ **ھدیً للناس** ۔ اور وہ مسلمان خود بھی ایک گروہ کے افراد نہیں تھے بلکہ انہیں اپنے منصب: **اخرجت للناس** کا پورا ادراک و احساس حاصل تھا۔اس لئے انہوں نے اس کتاب سے کسی گروہ کے بجائے پوری انسانیت کو بہرہ ور کرنے کی کوششیں کیں۔دعوت کے سارے کام، تمام علمی کاوشیں، جہد و جہاد کا پورا جذبہ اسی مقصد کیلئے تھا۔اس لئے ان مسلمانوں نے اپنی پوری دعوتی زندگی، معاشی فلاح اور تمدنی بھلائی کے تمام اقدامات میں پوری انسانیت کیلئے اس فیض و عطا کے دروازے کھلے رکھے۔ پھر وہ جہاں بھی گئے داستان چھوڑتے گئے۔

لیکن جب اس کتاب کو گروہی کتاب بنایا گیا۔اس کی تعلیم، اس کے قوانین، اس کی حکمت اور اس کی ہدایت کو نظر انداز کر کے اس کو گروہی خانوں میں بانٹ دیا گیا تو مسلمانوں کی وہ اقدامی، فکری اور انقلابی صلاحیت ہی ختم ہوتی گئی جس کی وجہ سے وہ دشت و دریا اور بحر و بر سر کرتے گئے تھے۔ پھر مسلمانوں کے گروہوں نے اسی کتاب کو اپنی گروہی زندگی کا ایسا رہنما بنا دیا جو ان کی عباداتی زندگی میں چند رسومات کیلئے رہنمائی کا ذریعہ بنا رہے یا پھر ان کی اپنی خواہشات کی تکمیل اور گروہی غلبہ کیلئے دلائل کا وسیلہ بنے۔

تاریخ کے اس چودہ سوٗ سالہ سفر میں آج ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قرآن مجید کے ہر سال لاکھوں نسخے شایع ہوتے ہیں۔گھروں میں، مسجدوں میں اور منبروں سے دن رات مسلسل اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔اس کے معانی و مطالب جاننے کیلئے تفاسیر کے ذخیرے موجود ہیں۔ اس کی تعلیمات کو بتانے کیلئے اور اس کے مطابق زندگی گذارنے کیلئے تقاریر کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ موجود ہے۔لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں علم و عمل کی روشنی و حرارت نظر نہیں آتی اور زندگیوں میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ بڑے عرصہ سے یہ ہوتا آرہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ذلت و پستی مسلمانوں کا مقدر بن چکی ہے۔

یہ اس وجہ سے ہے کہ قرآن ہماری زبانوں پر تو جاری رہتا ہے لیکن اس کی باتیں ہمارے دماغوں تک نہیں پہنچتیں۔ ہم الفاظ کے معانی تو جانتے ہیں لیکن قرآن کی دعوت کے مقاصد و حکمت سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔اس کو اپنی ذاتی زندگی کی ضرورتوں کا روحانی

حوالہ تو بناتے ہیں لیکن اس کے سماجی شعور سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ اس حوالہ سے ہم زیادہ سے زیادہ یہ شعور رکھتے ہیں کہ قرآن ہمیں ماضی کے اقوام اور جماعتوں کے قصے سناتا ہے۔ کافروں کے بارے میں، مسلمانوں کے بارے میں، عیسائیوں اور یہودیوں کے بارے میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے مومنین اور منافقین کے بارے میں اور بس۔

ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اللہ کے کلام ہونے اور خالق انسانیت کی طرف سے اپنی مخلوق کیلئے منشور ہونے کے ناطے ہم قرآن کی اس عظمت سے نابلد اور محروم ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے قرآن سے ہمارے تعلق کے جذبات اور روش بھی وہی رہتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ قرآن مجید جتنی تفکر و تدبر کی کتاب ہے اتنا ہی ہمارا اسے سمجھنے کا رویہ جامد اور مقلدانہ ہے۔ ہمیں اپنے والدین، اپنے گروہ اور اپنے مسلکوں سے جس طرح بھی قرآن مجید کی تشریحات ازبر کرائی جاتیں ہیں، ان کو یاد رکھنا اور پھر عمر بھر اس پر قائم رکھنا ہمارا وظیفہ اور وطیرہ بن جاتا ہے۔ اگر ہم اسی سلسلہ میں سوچنے کی قدرے روش رکھتے ہیں تو وہ بھی زمان و مکان کے قیود میں ہوتی ہے، ہم اس کو اپنی تہذیب و ثقافت کے قالب میں ڈھال کر پسند کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

قرآن مجید کی تعلیمات کو سمجھنے کیلئے ہمارا رویہ خالق کائنات کی تخلیقی مشیت کے مجموعی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں بار بار کائنات و انسان کی تخلیق کے نظام و مقاصد کی تفصیل موجود ہے۔ انسان کے خلافتی کردار اور تمکین و استخلاف فی الارض کی ذمہ داریوں کی تخلیقی مشیت خداوندی ہماری فکر و تدبر کا مرکز نہیں ہوتی۔ ہمارا رویہ اسلام کو ایک کامل دین سمجھنے کا نہیں ہوتا بلکہ روحانی زندگی کیلئے جس طرح بدھ مت، ہندومت اور عیسائی مت کے اصول ہیں، ہم اسلام کو بھی محض عباداتی زندگی کیلئے اسی طرح کی ایک مت سمجھتے ہیں۔ غلبۂ دین کیلئے جو رہنما اصول قرآن ہمیں بتاتا ہے ہم ان پر تفکر کرنے کیلئے بزدلی کا شکار بھی ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ راستہ بڑی آزمائش اور قربانی کا ہوتا ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جب سستے دین سے ہمارا پیروکار بننے کا دعویٰ بن جائے گا تو پھر ہم اسی سے اپنا کام نکالنے کے روادار بن جاتے ہیں۔ اس وقت ہم دین کی روح و حکمت کے تقاضوں کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے، ہم الفاظ کے حافظ بن کر چند عبادات و رسوم ادا کر کے خود کو دینداری پر قائم رہنے کا گمان عطا کرتے ہیں۔ ان محض عباداتی رسوم میں بھی ہم دین کے عباداتی

تقاضوں اور اللہ تعالیٰ کو مطلوب بندگی کے شعور سے عاری ہوتے ہیں۔

ہم روزانہ پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں اس میں فاتحۃ الکتاب الحمد کی روزانہ پچاس سے زیادہ مرتبہ تلاوت کرتے ہیں۔ وہ ہماری دعا بھی ہے، ہمارا اللہ سے عہد و اقرار بھی ہے اور اپنے لیے عمل کی راہ کا انتخاب بھی۔ لیکن ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جن پر الحمد للہ رب العالمین پڑھتے وقت یہ تصور و تفکر آشکار ہو کہ ربّ کیا ہوتا ہے، ربوبیت کسے کہتے ہیں اور ربوبیت اپنانے کا اس دنیا میں ہمارا عملی راستہ کیا ہے۔ عالمین سے کیا مراد ہے۔ جب عالمین کیلئے ربوبیت علت و معلول ہو تو عالمین کس چیز کا اجتماع ہوگا۔ کتنے لوگ الرحمٰن الرحیم پڑھتے وقت اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا شعور پا کر ان صفات کے عملی مظاہر کو اپنی زندگی کیلئے رہنما بناتے ہیں، اور پھر اگلی نماز میں خدا کی مخلوق پر اپنے رحم و التفات کی رپورٹ خدا کے حضور میں پیش کرتے ہیں۔ مالک یوم الدین تلاوت کرتے وقت اپنے اعمال کی بار بار حساب بنی کتنے لوگ اللہ کے حضور میں پیش کرتے ہیں۔ صرف اسی کی عبادت کا دعویٰ کرنے والا اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کیلئے اس ذات سے مدد کس چیز کی اور مدد کس عظیم مقصد کی مانگتا ہے۔ جب سیدھی راہ کی طلب کرتا ہے تو اس کے آئیڈیل کون ہوتے ہیں۔ اگر ابوبکر و عمر رضہ اس کے آئیڈیل ہیں تو ان کے طریقوں کو اس نے اپنی زندگی میں کتنا منعکس کیا ہے۔ غیر المغضوب اور ضالین سے بچنے کا عہد کرتے وقت وہ اپنے دور کے مغضوب اور ضالین سے بچنے کا کتنا ادراک و عمل رکھتا ہے!؟

قرآن مجید جب حق و باطل کے فرق کے بعد حق کے غلبہ اور باطل کے خاتمہ کی کتاب ہے تو قرآن کے ماننے والوں کو اس کتاب کی ہدایت سے اپنے دور کے مغضوب و ضالین سے نبرد آزما ہونے کا باقاعدہ شعور حاصل ہونا چاہیے۔ اگر اس ذمہ داری کا شعور و عمل قرآن کے ماننے والوں کو نہیں ہے تو پھر وہ اپنے منصب کی ادائیگی کس طرح کر سکتے ہیں۔

آدم کی ابتدائے آفرینش سے لیکر انسانی سفر کی تقریباً بیس ہزار سالہ زندگی میں کس طرح انبیاء کرام اور ان کے متبعین نے وقت کے فرعون و قارون، مستکبرین و مترفین کے ساتھ انسانوں Masses کی آزادی اور معاشی حقوق کیلئے جہد مسلسل کی۔ غلامی کی تمام صورتوں کے خلاف جنگ کی، جہد کی، بغاوت کی اور بڑی سے بڑی آزمائشوں سے گذر کر انسانیت کو آزادی کی نعمت سے سرفراز کیا۔ انسانیت کی ترقی میں اور الناس یعنی Masses

اکثریتی عوام کو حق وانصاف اور فلاح وفوز عطا کرنے میں قرآن کی تعلیمات کے حاملوں نے کس طرح ان کے اصولوں پر ایک عظیم خلافت کی بنیاد ڈالی اور اس خلافت کو دنیا کی مثالی و فلاحی سلطنت کی حیثیت دی۔

قرآن مجید میں انسانوں کی اجتماعی زندگی میں ان کے معاشی اور تمدنی اداروں کے توازن اور کامیابی کے رہنما اصول کھول کھول کر بیان کئے گئے ہیں۔ان اصولوں کی بنیاد پر ہی اسی عظیم سلطنت کی بنیاد پڑی لیکن بعد میں ہم خود کو اصطلاحات کی اپنی تراشی ہوئی معانی کے قید میں قید کر کے اپنے لیے محرومیوں کا سامان پیدا کرتے گئے۔

اگر ہم مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بحالی چاہتے ہیں اور گذشتہ ایک ہزار سالہ ناکامیوں سے نکلنا چاہتے ہیں تو ہمیں قرآن کے اس سماجی شعور اور تبدیلی کی ہیئت کو سمجھنا ہوگا جس پر قرون اولیٰ کے مسلمان عمل پیرا تھے۔ہمیں قرآن کی تعلیم حاصل کرتے وقت اس کو تبدیلی و انقلاب کا آج کے دور میں بھی اسی طرح منبع سمجھنا ہوگا جس طرح وہ چودہ صدیاں پہلے انقلاب وتبدیلی کا منبع تھا۔اس لئے کہ ایک تو اس کی ہدایت عالمگیر وابدی ہے اور دوسری بات یہ کہ انسانوں کی سرشت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔نیکی اور بدی، ظالم اور مظلوم، مستکبر ومستضعف، مجبور وطاغوت، منکر ومشکور آج بھی اسی طرح موجود ہیں۔صرف ان کی شکلیں اور طریقے تبدیل ہوئے ہیں۔مکہ کے مشرک، مدینہ کے یہودی، نجران کے عیسائی اور مدینہ کے مومن اور غیر مومن چاہے اب نہ پائے جاتے ہوں مگر یہ کردار ہمارے چاروں طرف موجود ہیں۔اگر ہم خدا کو مطلوب، عملی زندگی اختیار کرتے ہیں تو ان کرداروں کا وجود آج بھی ہمارے گرد محسوس ہوگا۔

قرآن مجید آیا ہی اس لئے ہے کہ وہ نیکی اور بدی کے فرق کو واضح کرے، وہ ظالم اور مظلوم کے درمیان حدِّ فاصل کھینچے۔وہ مستکبرین کو اپنے انجام تک اور مستضعفین کو اپنے اکرام تک پہنچائے وہ مجبور کو آزادی سے سرفراز کرے اور طاغوت کو مقہور بنائے۔وہ منکرین کو گرفت میں لانے کا ذریعہ اور مومنین کے لئے شکر وسپاس کی زندگی کا سندیسہ بنے۔اس لئے آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہو پاتا جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔جب آپ عملی طور پر دعوت الی اللہ کے کام کا آغاز کریں گے تو قرآن کی ہدایات وتعلیمات آپ کی رہنما بنتی جائیں گی اور جس طرح آپ قدم بڑھاتے

جائیں گے آپ کو وہ تجربات سامنے آتے جائیں گے جو نزول قرآن کے وقت سامنے آتے گئے۔آپ کو مکہ وطائف کے مشرکین کی ذہنیت سے بھی واسطہ پڑے گا اور مدینہ کے یہودیوں کی مکاریوں سے بھی نمٹنا ہوگا۔ابو جہل وابولہب جیسے سرکش وسرمایہ داروں کی سازشوں کے تانے بنے ہوئے بھی ملیں گے اور منکرین وطاغوت کی رکاوٹوں کا جال بچھا ہوا بھی ملے گا۔وہ مسائل بھی سامنے ہونگے اور وہ رکاوٹیں بھی حائل ہونگیں۔اُس وقت قرآن کی عملی رہنمائی آپ کے لیے ان رکاوٹوں کو ختم کرتے ہوئے جہد کے کئی راستے بناتی جائے گی اور تبدیلی کے کئی مواقع آپ کے سامنے آتے جائیں گے۔اسی طرح اگر آپ نے اپنی روزانہ کی زندگی میں انسانوں کا اور سماج کا کوئی کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے اور اس کے لیے آپ نے جہد کا راستہ اختیار کیا ہے تو یہ قرآن آپ کے لیے راستے آسان بناتا جائے گا۔

لیکن اگر آپ کی کوئی عملی زندگی ہے ہی نہیں، انسانوں اور سماج کا کوئی ذمہ آپ نے اٹھایا ہی نہیں ہے، انسانوں کی آزادی، وقار اور فلاح کیلئے ہونے والی کوششوں کے آپ رفیق کار ہی نہیں بنے تو آپ قرآن سے اپنا عملی تعلق قائم ہی نہیں کرسکتے۔آپ صرف میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر قرآن کے مطالعہ سے رہنمائی تلاش کرنا چاہتے ہیں تو آپ کے مطالعہ میں اضافہ ضرور ہورہا ہے لیکن آپ کی خدا کو مطلوب ایک ذمہ دار انسان کے طور پر تشکیل نہیں ہورہی۔اسی طرح آپ کسی چار دیواری میں چند عباداتی رسومات کی ادائیگی سے قرآن پر عمل کی حاصلات کا گمان رکھتے ہیں تو اس صورت میں بھی آپ قرآن کی تعلیمات کے ایک بڑے حصے سے محروم رہ جاتے ہیں۔

قرآن کے احکام، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی معاشی اور تمدنی ہدایات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اصول وقوانین آدمی کی سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے۔نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کو اس کی تمام شعبہ ہائے زندگی میں پیروی سے آزاد کر رکھا ہے اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہوسکتی ہے جس کے اجتماعی ادارے قرآن کی بتائی ہوئی تعمیر انسانیت کی تعلیمات کے خلاف چل رہے ہوں۔

ابو الفضل نور احمد

مولانا سندھی کا فہم قرآن

علوم اسلامیہ میں قرآن مجید کو متن کتاب کا درجہ حاصل ہے اور دیگر علوم کو حواشی کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ امت مسلمہ کو رسول اکرم ﷺ نے کتاب وحکمت کی تعلیم دی تھی۔ انہوں نے رسول پاک ﷺ کے اقوال وافعال سے اصول کلیہ اخذ کیے جنہیں سنت کا نام دیا گیا۔ کچھ لوگ اخبار واقوال میں دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے اقوال وافعال رسول کی تدوین کی اور احادیث کے کئی مجموعے مرتب ہوگئے اس طرح ایسی مستند اور نیم مستند کتابیں مدون ہوگئیں جن میں سنت رسول اپنی تشریحی اور تفصیلی صورت میں نظر آتی ہے۔

امت مسلمہ کو جب نئے احوال وظروف کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول کی راہنمائی میں نئی قانون سازی کی اور یوں کئی قومی قوانین مدون ہوئے۔ اس عہد کی عظیم ہستی کا نام امام ابوحنیفہ ہے جنہوں نے اصول قیاس پر عمل کر کے کتاب وحکمت کے رشتے کو نئے نتائج سے مربوط کیا۔

عقل اور عقیدے کی سرحد پر علم کلام کا جلوہ نظر آتا ہے، جو دونوں کے مابین مکالمے کی کوشش ہے ویسے کئی جگہ یہ علم مکالمے کی بجائے محاربہ بھی بن گیا ہے۔ اسی طرح عقیدہ و ایمان، دلوں کے اندر اترتا ہے تو تصوف اس باطنی واردات کی گواہی دیتا ہے۔ مسلمان علماء نے علم کلام اور تصوف پر بھی کتابیں لکھیں، بلکہ ایک زمانے میں علم کلام کو فقہ اکبر تک کہا گیا۔ علم تصوف مسلمان معاشرے میں ہمیشہ ہی معزز ومحترم رہا، تصوف تو دلوں کو اجاگر کرتا، انسان دوستی کے احساسات کو جلا بخشتا اور انسان کے من سے سرگوشی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے جملہ فنون لطیفہ اور اولیائے کرام کے باطنی احوال وسماجی کردار میں تصوف ہر جگہ ہم رکاب نظر آتا ہے۔ اس سے آگے بڑھیں تو اسلام میں الاہیات کا شعبہ بھی تصوف

والوں کے پاس نظر آتا ہے۔ صوفی عالم ناسوت سے لاہوت تک کی دنیا کی مابعد الطبیعی تعبیریں اور تفسیریں پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔

علم کلام اور تصوف محترم سہی، ان کی عظمت بھی مسلم سہی، مگر اجتماعی زندگی کے ڈسپلن کے لئے قانون کی اہمیت معاشرتی عمارت میں بنیاد کے پتھر جیسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ کی بنیاد پر معاشرے کی تشکیل ہوئی اور ائمۂ فقہ کی تقلید☆ کی گئی۔ اگرچہ بعض لوگوں نے ائمۂ حدیث کی بھی تقلید کی۔ مگر امت مسلمہ کی اکثریت نے ہمیشہ ائمۂ فقہ کی تقلید کی۔ فقہ کی ترتیب وتدوین میں بڑی عرق ریزی ہوئی۔ اصولِ فقہ مدون ہوئے اور فقہ کی جزئی تعبیرات پر بیش بہا اور مفصل بحثیں ہوئیں۔ ائمۂ فقہ کی تقلید نے معاشرے میں ڈسپلن پیدا کیا۔ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ اسی فقہ کی بدولت منظم ومربوط رہی۔ عمومی صورت حال میں یہ تقلید بہت مفید بھی تھی اور ضروری بھی، مگر جونہی احوال زمانہ میں تغیر آیا، تقلید زنجیر پا بن گئی۔ تاریخ اسلامی میں بعض مواقع پر صوفیائے کرام نے مجتہدانہ رویہ اختیار کیا۔ اگرچہ انہوں نے مجتہد ہونے کا نہ دعویٰ کیا اور نہ اپنے اجتہاد کے لیے فقہی دلائل فراہم کیے۔ اس کے باوجود صوفیاء کے طرز عمل میں نئی راہ تراشنے اور بند دیوار میں روزن تلاش کرنے کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ کے زمانے تک موجود فقہی ذخیرہ امت کی رہبری کرتا رہا اور بہت سی علمی ضروریات پوری کرتا رہا۔ اس دوران میں قدیم علم کلام، عقل اور شریعت میں مکالمے کا ذریعہ رہا اور قدیم تصوف ذہنی اور روحانی ضرورت کے لیے کافی ثابت ہوتا رہا یہ سارا ذخیرۂ علم وعمل قرآن مجید سے ماخوذ اور مستفید تھا۔ اس سارے ذخیرۂ علم کا سرچشمہ کتاب وحکمت کی تعلیم تھی، مگر امام ولی اللہ کی زندگی میں قدیم صورت حال باقی نہ رہی۔ معاشرتی احوال وظروف بدل گئے۔ زندگی کی قدیم راہیں متروک ہوگئیں۔ اس نئی صورت حال میں امام ولی اللہ، امام زمانہ ہونے کے مدعی تھے۔ ان کے دعوے کی دلیل فقط یہی تھی کہ انہوں نے جدید زندگی میں کتاب وحکمت سے استفادے اور نئے علوم دینیہ کی تشکیل و تدوین کی راہ ہموار کی ہے۔

امام ولی اللہ نے قرآن مجید اور حدیث رسول کی تفہیم، فقہ، تصوف اور علم کلام کی تشکیل

(ا) یہاں تقلید سے اصطلاحی تقلید یعنی ائمہ فقہ کے اصول وضوابط کی تقلید مراد نہیں بلکہ لغوی مفہوم مراد ہے اسے مکھی پر مکھی مارنے اور ایک ایک لفظ پر آنکھیں بند کر کے ایمان لانے کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔

جدید کے لئے نئی بنیادیں فراہم کیں۔انہوں نے علم کلام کے لیے شریعت مطہرہ کے اسرار و حکم اور معاشرے کی تفہیم کے لیے نئے عمرانی علم کی بنیاد رکھی جسے آپ ارتفاقات معاشیہ کا نام دیتے ہیں۔امام ولی اللہ کو معلوم تھا کہ جدید علم کلام نظری فلسفوں کے حوالے سے نہیں، عمرانی مسائل کے حوالے سے ہی تشکیل پائے گا۔امام ولی اللہ نے تصوف میں کئی اجتہادات کیے۔ انہوں نے لطیفۂ جوارح کا انکشاف کر کے شریعت و طریقت کو یکجا کیا۔انہوں نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں قدیم مناقشہ ختم کرنے کے لیے ان دونوں کے مابین تطبیق بھی فرمائی۔اسی طرح حدیث کے علم کے فروغ کے ساتھ فقہ کو علمی بنیاد فراہم کی۔

یہ ساری کاوشیں اپنی جگہ بہت اہم تھیں، مگر ان کی یہ کوشش ان کے سب کاموں پر بھاری اور ان کے تمام علوم میں افضل نظر آتی ہے کہ انہوں نے متن قرآن کی تفہیم، تعلیم اور تدبر کا آغاز کیا۔انہوں نے قرآن مجید کی تعلیم کو کچھ اس طرح فروغ دیا کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ رجوع الی القرآن کی تحریک کے علمبردار ہوں۔انہوں نے تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ اصول تفسیر پر بھرپور انداز میں قلم اٹھایا اور اس انداز میں اصول تفسیر مرتب و مدون کیے کہ یہ قرآن حکیم کے مطالعے کی بنیاد بن گئے۔موجودہ صورت حال میں یہ بات شاید عجیب محسوس نہ ہو کہ اب امام ولی اللہ کے رجوع الی القرآن کی تحریک اس قدر فروغ پا چکی ہے کہ اب یہ عجیب نہیں رہی۔ امام ولی اللہ نے جب یہ کام کیا تھا تو وہ دور حاشیوں کا دور تھا۔حاشیوں کے دور میں متن کی طرف رجوع کی دعوت آسان نہیں۔

علوم اسلامیہ کی کتابوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض کتابوں کے حاشیے لکھے گئے، پھر ان کے حاشیے لکھے گئے اور یوں حاشیوں پر حاشیے لکھے گئے۔حاشیوں پر حاشیے لکھنے والوں سے اجتہاد کی توقع کرنا یا نئی فکر کے فروغ کی امید رکھنا یقیناً کار عبث ہے۔

امام ولی اللہ دہلوی نے حاشیوں پر حاشیے لکھنے کی بجائے یا تو کتابیں لکھیں یا کتابوں کے بارے میں لکھا۔انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اور حاشیہ لکھا۔انہوں نے مؤطہ امام مالک کے دو حواشی (عربی اور فارسی حواشی: المسویٰ اور المصفیٰ) لکھے اور یوں حاشیوں پر حاشیہ لکھنے کی روش سے گریز کیا۔انہوں نے بعض ایسی کتابیں لکھیں جنہیں ان کے متعلقہ علوم میں متن قرار دیا جاسکتا ہے۔تصوف، علم کلام، تاریخ، حدیث، سنت اور تفسیر میں ان کا درجہ مقلد کی بجائے مجتہد کا ہے۔اگرچہ انہوں نے اپنے لیے مجتہد مطلق کی بجائے مجتہد فی المذہب اور مجتہد منتسب کا لقب پسند فرمایا۔

راقم الحروف کے استاد شیخ القرآن حضرت مولانا محمد طاہرؒ نے مولانا ابوالکلام کی تفسیر: ترجمان القرآن کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا:

''ترجمان القرآن (مولانا ابوالکلام) کو تفاسیر میں متن قرار دیا جاسکتا ہے اور دوسری تفاسیر کو حواشی کہا جاسکتا ہے۔''

امام ولی اللہ دہلوی کی تصانیف، خصوصاً ترجمہ و حاشیہ قرآن ''فتح الرحمٰن'' کے بارے میں یہی بات زیادہ یقین اور وضاحت سے کہی جاسکتی ہے۔امام ولی اللہ دہلوی نے فتح الرحمٰن کے نام سے قرآن مجید کا ترجمہ اور حاشیہ لکھا۔تفسیر میں اصول تفسیر پر الفوز الکبیر لکھی اور قرآن مجید کے ایک جزو کی تفسیر بھی لکھی۔

الفوز الکبیر سے پہلے سیوطی کی الاتقان کے نام سے اصول تفسیر پر ایک کتاب ملتی ہے یا ابن تیمیہ کا ایک رسالہ اور باقی سب خیریت ہے۔گویا اصول تفسیر کا موضوع مصنفین کے لیے بارہ پتھر باہر تھا کہ امام ولی اللہ دہلوی نے اس موضوع پر محققانہ کام کیا۔قرآن مجید اور حدیث کی تعلیم عام ہونے سے ہی مجتہدانہ سوچ پروان چڑھ سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے قرآن و حدیث کی تعلیم اور سماجی علوم پر کام کے آغاز سے در اجتہاد کھول دیا تھا اور یہ دروازہ زبان حال سے کہہ رہا تھا:

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب، ساقی پہ صلا میرے بعد

یہ حریف مے مرد افگن عشق امام عبیداللہ سندھی تھا۔یہ وہ دانائے راز تھا جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے:

عمر ہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

ترجمہ: ''زندگی، کئی سالوں تک عبادتگاہوں میں بھٹکتی رہتی ہے، تب جا کے بزمِ عشق سے، اسے ایک دانائے راز سامنے آتا ہے۔''

یہ دانائے راز امام ولی اللہ سے شیخ الہند تک کے علوم قرآن کا وارث تھا۔شیخ الہند نے وہ سارا علم جو اپنے اسلاف سے حاصل کیا اپنے شاگرد رشید امام سندھی کو منتقل کر دیا۔امام

سندھی سے پہلے دیوبندی بزرگوں کے ہاں ذوق تفسیر پختہ ہو چکا تھا۔ دیوبند کے بزرگ حضرت رشید احمد گنگوہیؒ (راقم انہی کے فیض یافتہ ایک خاندان میں پیدا ہوا) اور حضرت مظہر نانوتوی کے شاگرد رشید شیخ القرآن حضرت مولانا حسین علی کی تفسیر ''بلغۃ الحیر ان'' اس بات کا ثبوت ہے کہ دیوبندی بزرگ قرآن مجید میں کس طرح پر تدبر کر رہے تھے اور کس زمانے میں ربط سور و آیات پر غور و فکر فرما رہے تھے۔ بلغۃ الحیر ان پر افادات مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد مظہر نانوتوی لکھا ہوا ہے۔ ان دونوں بزرگوں کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب نظام القرآن کے مصنف مولانا حمید الدین فراہی ابھی دیوار دبستان پر لام الف لکھتے تھے:

مولانا سندھی نے شیخ الہند سے قرآن مجید کے اسرار و غوامض سیکھے۔ انہوں نے اپنے اساتذہ اور اسلاف کا علم کس طرح مولانا کو پہنچایا، اس کے بارے میں مولانا سندھی کی اپنی ہی روایت ہے۔

> ''ہم (مولانا سندھی) نے امام فخر الدین رازی (متوفی ۶۰۶ھ) کی تفسیر پڑھی۔ نیز جار اللہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی تفسیر کا مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ معالم التنزیل از ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی (متوفی ۵۱۰ھ) اور تفسیر حافظ عماد الدین ابوالغداء اسماعیل بن عمر المعروف ابن کثیر (متوفی ۴۷۷ھ) بھی پڑھی۔ ان سب تفسیروں کے ذریعہ ہم نے قرآن کو سمجھنے کی اپنی استطاعت کے مطابق پوری کوشش کی، لیکن سوائے تحیر کے ہمیں کچھ نصیب نہ ہوا۔ اگر زمانہ طالب علمی میں ہم نے نجم الائمہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ سے چند آیتوں کی تفسیر، جو کتابوں میں نہیں ملتی، نہ سنی ہوتی اور ہمارے لیے وہ اطمینان کا ذریعہ نہ بنتی، نیز شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بعض تفسیری جملے ہم نے نہ پڑھے ہوتے، تو قدماء کی ان تفسیروں کو پڑھ کر ہم علم تفسیر کے حصول سے قطعاً مایوس ہو جاتے۔ بے شک ہم اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ پہلے زمانے میں مسلمانوں نے ان ہی کتابوں کی مدد سے قرآن سمجھا تھا اور ان ہی اصول و قواعد پر انہوں نے اپنے اجتہاد کے مطابق قرآن کی حکومت قائم کی تھی، لیکن جہاں تک اس زمانے کا تعلق ہے، ہمارے لیے اس قسم کی تفسیروں سے قرآن فہمی ناممکن ہے۔'' (شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ صفحہ ۵۴)

حضرت شیخ الہند، فخر الدین رازی اور علامہ تفتازانی کی اپنے اساتذہ مولانا محمد قاسم

نانوتوی اور ان کے اسلاف کے مقابلے میں تغلیط اور تردید فرماتے تھے۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ یہ نیا عہد حضرت امام ولی اللہ اور ان کے متبعین اور منتسبین کا ہے۔

حضرت مولانا سندھی کا ذوق قرآن فہمی دیوبند میں پروان چڑھا۔ انہوں نے قرآن فہمی کے لیے شامل نصاب تفاسیر کی تدریس و تعلیم کو پہلے روز ہی ناکافی قرار دے دیا اور یقیناً ان کے اس رویے کے پس منظر میں حضرت شیخ الہند کی تعلیم و تربیت موجود ہے۔ ویسے تو مولانا حسین علی اور انکے اساتذہ قرآن کی تعلیم لیے کتب تفسیر پڑھانے کے بجائے براہ راست قرآن مجید کی تدریس کا سلسلہ قائم کر چکے تھے، یہ سلسلہ بھی حضرت امام ولی اللہ سے چلا تھا اور ان کے اتباع کے سارے سلاسل میں متعارف ہوا تھا۔ امام سندھی جب دیوبند سے نکالے گئے تو بہت سی باتوں پر مجرم ٹھہرائے گئے تھے۔ ان باتوں کا سلسلہ قرآن فہمی تک جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ امام سندھی اپنے استاد شیخ الہند کی طرز پر قرآن کو سمجھ رہے تھے اور ان کے مخالفین قدماء کی طرز پر اور پھر طرز کہن پر اڑنے والوں نے شیخ الہند کے اس عظیم شاگرد کو دیوبند سے نکال دیا۔

مولانا سندھی نے اپنے استاد شیخ الہند کے حکم سے دہلی میں کام شروع کیا تو اپنے ادارے کا نام نظارۃ المعارف القرآنیہ رکھا۔ یہیں مولانا احمد علی لاہوری نے امام سندھی سے تفسیر پڑھی مگر افسوس کہ آگے چلکر حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کن ناعاقبت اندیش لوگوں کی صحبت میں آ کر حضرت سندھی سے نسبت برقرار نہ رکھ سکے!

مولانا سندھی کابل گئے تو وہاں اپنے شاگرد ظفر حسن ایبک کو قرآن پڑھایا۔ مولانا روس گئے، ترکی گئے اور پھر لوٹ کر مکہ معظمہ آ گئے۔ آپ نے مکہ معظمہ میں بہت سوں کو قرآن پڑھایا اور بہت سے قرآن سمجھنے کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔

شیخ القرآن مولانا محمد طاہر نے راقم الحروف سے بیان فرمایا کہ وہ تین دوسرے علماء کے ساتھ حج پر گئے۔ وہاں یہ چاروں حضرات امام سندھی کے حضور حاضر ہوئے۔ امام سندھی نے تعارف کے فوراً بعد ان حضرات سے قرآن مجید کی ایک سورۃ کی تفسیر پوچھی۔ ایک صاحب چپ رہے۔ ایک نے معذرت کر لی اور ایک صاحب نے عالم ہونے سے ہی انکار کر دیا۔ ان تینوں حضرات علماء کے نام بتانے سے عمداً گریز کیا گیا ہے تا کہ بعض بزرگ پرستوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔ ان تین علماء میں سے ایک نے حضرت نے امام سندھی کی تکفیر فرما کر ہمارے جذبات کو ٹھیس پہنچائی اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ چوتھے مولانا

طاہرؒ نے سبقت کی اور تفسیر بیان کی۔ مولانا طاہر کے سوا تینوں کی خوب درگت بنی اور امام سندھی نے ان لوگوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ مولانا طاہرؒ کو روک لیا اور انہیں سال بھر پڑھاتے رہے۔ اس واقعہ کی شہادت شیخ القرآن کے صاحبزادے مولانا محمد طیب بھی دیں گے کیونکہ جس مجلس میں شیخ نے یہ واقعہ بیان کیا اس مجلس میں مولانا محمد طیب بھی شریک تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔

امام سندھی نے عمر بھر قرآن مجید کو پڑھا اس پر تدبر کیا اور اس کی تعلیم دی۔ اس کی اردو میں تفسیر المقام المحمود لکھوائی۔ عربی میں قرآن مجید کی تفسیر ''الہام الرحمٰن'' لکھوائی۔ پھر برصغیر میں لوٹ کر آئے تو بعض مقامات پر قرآن مجید کی مختلف سورتوں کے درس دیے جو بعض حضرات نے مرتب کر کے شائع کر دیے۔ یوں خدمت قرآن کا کام عمر بھر جاری رکھا۔ ان کا کام آج بھی جاری ہے اور انشاء اللہ تا ابد جاری رہے گا۔

مولانا سندھی کا علم کا سفر عمر بھر جاری رہا۔ انہوں نے ہر راست فکر مفکر کی طرح اپنی رائے بدلنے یا اس میں حک و اضافہ کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ اس لیے ان کے آخری دور کا فہم قرآن جس درجے کا ہے ابتدائی دور میں ڈھونڈنا مناسب نہیں لیکن ہر عظیم انتہا کے لیے ابتداء بھی عظمت سے محروم نہیں ہوتی۔ امام سندھی کا ابتدائی دور کا فہم قرآن بھی جس اعلیٰ سطح کا تھا بہت سوں کی انتہا بھی وہاں تک نہیں پہنچتی۔ اس ابتداء سے آج بھی استفادہ ممکن ہے۔

امام سندھی نے ۱۹۱۴ء میں راولپنڈی میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس میں خطبۂ صدارت پڑھا، جس کا موضوع فہم القرآن ہے۔ یہ خطبۂ صدارت ''قرآن کا مطالعہ کیسے کیا جائے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کا مطالعہ نہ صرف مولانا سندھی کی قرآنی فکر کی تفہیم میں مددگار ہوگا بلکہ مولانا سندھی کے فکری ارتقاء کی ابتدائی منازل کی خبر بھی دے گا۔ یہ مقالہ پہلی منزل پر اس بات کی آگہی بخشتا ہے کہ مولانا سندھی ۱۹۱۴ء میں جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے مخاطب تھے تو ان کے مدنظر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو قرآن مجید کے معارف سے آگاہ کرنا تھا۔ خطبہ کے ابتدائی کلمات سے پتا چلتا ہے کہ آپ اس سے پہلے بھی ایجوکیشنل کانفرنس سے خطاب کر چکے تھے۔ سر سید مرحوم کی قائم کردہ اس تنظیم کے اجلاسوں میں مولانا سندھی کی شرکت ان کے اس نقطۂ نظر کا عملی مظہر ہے کہ جدید طبقہ کو قرآن مجید کی تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔

مولانا سندھی نے اس مقالے میں دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید کی مروج تفاسیر قرآن فہمی میں ہرگز مکمل تعاون نہیں کرتیں۔ وہ پہلی منزل پر ہی تفاسیر کی تعلیم کی بجائے قرآن مجید

کی تعلیم کی دعوت دیتے ہیں۔ مسلم معاشرے میں سینکڑوں سالوں سے تفاسیر کی تعلیم کو قرآن مجید کی تعلیم کا قائم مقام سمجھا جاتا تھا، مگر امام ولی اللہ دہلوی نے تفاسیر کے بجائے قرآن مجید کی تعلیم کو رواج دینے کی کوشش کی۔ یہ عام سی تبدیلی نہیں تھی، ایک انقلابی اقدام تھا۔ یہ تفسیری بھول بھلیوں سے نکلنے، جمود میں مبتلا رہنے اور اندھی تقلید میں مگن رہنے کی نفی تھی۔ یہ براہ راست قرآن مجید کے حضور حاضری اور حضور ہے۔ اس سے بلاواسطہ فیض یاب ہونے کی کوشش اور کاوش ہے اور مجتہدانہ فکر اور سوچ کا آغاز ہے۔ امام ولی اللہ کی فکر کے اجمال کی تفصیل امام سندھی کے ہاں ملتی ہے۔ اسی لیے امام سندھی تفاسیر کی تعلیم کی نفی، جرأت اور وضاحت سے کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس وقت تک آپ ابھی برصغیر میں تھے، کابل اور روس کے سفر اور عالمی افکار کا مطالعہ ابھی بہت دور تھا۔ اس لیے دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ امام سندھی کے ان خیالات کے پس منظر میں شیخ الہند کی تعلیم و تدریس یقیناً شامل تھی۔ امام سندھی فرماتے ہیں:

> ''افسوس ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن تو ہم سمجھ نہیں سکتے البتہ مختلف حضرات نے (اپنے اپنے خیالات کے لحاظ سے) جو شرحیں (تفسریں) قرآن کریم کی لکھی ہیں وہ ہم سمجھ سکتے ہیں اور انہیں کو سمجھنا اور ان شرحوں کو سمجھنے کی کوشش کو لوگوں نے قرآن کی تعلیم سمجھ رکھا ہے۔ اگر یہ شرحیں اور تفاسیر ایسی ہوتیں کہ فقط قرآن مجید کا صحیح مطلب ادا کرتیں تو اس میں کوئی نقصان نہ ہوتا، لیکن غضب تو یہ ہے کہ مختلف لوگوں نے مختلف زمانوں میں ماحول کے مختلف اثرات سے متاثر ہو کر جو طرح طرح کی باتیں اپنی شرحوں اور تفاسیر میں ایسی درج کی ہیں کہ ان میں اور قرآن میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ لوگ ان باتوں کو قرآن کی تعلیم سمجھنے لگے ہیں اور حقیقت میں وہ قرآن کی تعلیم سے کوئی علاقہ نہیں رکھتیں۔''

امام سندھی، امام ولی اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر اس منزل پر پہنچے کہ آپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ:

> ''قرآن کی تعلیم اور تفسیر علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں دونوں ایک چیز نہیں۔ قرآن خود ایک مستقل کتاب ہے۔''

ہمارے قدیم علماء کے ہاں فہم قرآن کے لیے بہت سے علوم شرط ٹھہرائے گئے۔ ان علوم کی تعداد ہر دور میں بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ بعض علماء نے ان علوم کی فہرست دو درجن سے بھی بڑھادی۔ امام ولی اللہؒ نے اس افسانے کی تردید کی اور بڑی وضاحت سے ارشاد فرمایا:

''اور میں اب طالب علموں سے کہتا ہوں کہ اے بیوقوفو، جو خود کو علماء کا خطاب دیتے ہو! تم یونانیوں کے علوم میں مشغول ہو گئے اور صرف ونحو میں پھنس گئے اور تمہارا خیال ہے کہ یہ حقیقی علم ہے۔'' (تفہیمات الالٰہیہ)

امام سندھی نے اسی بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا:

''قرآن خود ایک مستقل کتاب ہے اور صاف سلیس عربی میں ہے۔''

امام سندھی اس مقصد کے لیے قرآن سے ہی استناد فرماتے ہیں:

فانما یسر ناہ بلسانک لعلھم یتذکرون (الدخان: ۵۸)

''پس اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

امام سندھی اس مقصد کے لیے تدبر قرآن کی اہمیت واضح کرتے ہیں اور قرآن کو تفاسیر کی بجائے قرآن سے براہ راست سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس کتابچے کے دوسرے باب میں امام سندھی، تفسیر ماثور کے افسانے کی حقیقت بھی واضح کرتے ہیں۔ دراصل مختلف آیات کے سلسلے میں صحابہ کرام کے تفسیری اقوال مشہور ہو گئے۔ ان کی حقیقت کیا تھی؟ اس کے ساتھ ہی شان نزول کے سلسلے میں بے شمار روایات تراش لی گئیں اور ان سب سے بڑھ کر فضائل قرآن اور مختلف سورتوں کے فضائل کے سلسلے میں جو روایات تراشی گئیں ان کے متعلق صرف تفسیر بیضاوی کا مطالعہ ہی کافی ہوگا۔ تفسیر ماثور کے سلسلے میں امام سندھی نے صاحب کشف الظنون کے حوالے سے اور علامہ سیوطی کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ تفسیر قرآن کے سلسلے میں بہت سے غیر صحیح اقوال صحابہ کرام سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں امام سندھی نے علامہ سیوطی کا یہ حوالہ نقل کیا ہے:

''میں نے غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کی تفسیر میں دس مختلف قول دیکھے ہیں حالانکہ رسول اللہ ﷺ اور سب صحابہ کرام اور تابعین سے یہود ونصاریٰ کے سوا اور کچھ مروی نہیں۔''

امام سندھی نے تفسیر ماثور کی حقیقت واضح کرنے کے ساتھ ان تفاسیر کی اصلیت بھی واضح فرمادی ہے جنہوں نے قرآن مجید کو اپنے پسندیدہ علم میں محیط کرنے کی کوشش کی ہے۔

کسی نے اسے علم صرف ونحو میں محصور کرنے کی کوشش کی، کسی نے عجائب وغرائب کا قرآن سے تعلق جوڑا اور کسی نے اسے الحاد سے جاملایا یعنی:

تاویل بڑھ کے اقرب الکفر ہوگئی
کچھ نہیں ہے شیخ تیرے علم وفن سے دور

امام سندھی کی دعوت صرف اور صرف یہی ہے کہ قرآن کی طرف لوٹ جاؤ یعنی حاشیے کو چھوڑ کر متن کی طرف لوٹ آؤ۔

قوموں کا عروج وزوال اس کے فکر ونظر کو کس قدر تبدیل کرتا ہے اس سلسلے میں امام ولی اللہ دہلوی کا یہ قول معروف ہے:

اماالا خلاق بالا حوال لابالعلوم

''اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اخلاق کا دارومدار احوال پر ہے علوم پر نہیں۔''

امام سندھی نے تفسیر قرآن حکیم اور مسلمانوں کے عروج وزوال کا رشتہ بھی دریافت کیا ہے اور یہی جدلیاتی رویہ ہے۔ واضح رہے کہ جدلیات کسی بھی چیز کو تسلسل میں اور تمام حوالوں سے دیکھنے کو کہتے ہیں۔ امام سندھی نے اس سلسلے میں لمبی چوڑی بحث اٹھانے کی بجائے بعض کلیدی الفاظ کی تفسیر پر بحث فرمائی ہے۔ یہ الفاظ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں کلیدی حیثیت بھی رکھتے ہیں اور قرآن حکیم کی دعوت میں بھی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ الفاظ ''توکل'' اور ''صبر'' ہیں۔ زوال کے دور میں قرآن کے ان دو اہم ترین لفظوں کا غیر قرآنی مفہوم امت مسلمہ میں رائج ہو گیا اور یوں دعوت قرآن کا مفہوم الٹ ہو گیا۔

قرآنی الفاظ کا مفہوم اس لیے بھی الٹ ہو گیا کہ قرآن کی صرف تفسیر پڑھی گئی اور عربی مدارس میں اب بھی صرف اڑھائی پارے کی مفصل تفسیر شامل نصاب ہے۔ قرآن حکیم کے جو کچھ مدنظر تھا اور اس میں سے بہت کچھ مہجور کر دیا گیا تو قرآن مجید کی مکمل دعوت وتعلیم نظر انداز ہو گئی۔ ابن خلدون نے اسلام کو صرف فلاح آخرت کے لیے ضروری قرار دیا تھا۔ ہمارے امام سندھی کے عہد میں یہی خیال عقیدے کا روپ دھار گیا۔ امام سندھی نے واضح کیا کہ قرآن مجید انفرادی اور اجتماعی زندگی کو فلاح اور عزت کا راستہ دکھاتا ہے۔ یہ اخروی زندگی کی فلاح کا ضامن بھی ہے اور دنیاوی زندگی میں عزت کا ذریعہ بھی۔ ہمارے قدیم علماء تجارت کرتے تھے اور باعزت زندگی گزارتے تھے۔ امام ابوحنیفہ کپڑے کے تاجر تھے۔

ایسے ہی بہت دوسرے علماء باعزت طریق سے روزی کماتے تھے۔ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے:

حرف دعاء و دست سخاوت کے باب میں
خود میرا تجربہ ہے وہ بے حد نجیب تھا

ان نجیب لوگوں کو قرآن نے فقر غیور کا راستہ اپنانے کی دعوت دی تھی۔ میرے استاد شیخ القرآن مولانا محمد طاہر کہا کرتے تھے کہ مفتی کے لیے فتویٰ پر پیشہ لکھنا ضروری ہے۔ اگر وہ پیشہ نہیں لکھتا تو مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ دین سے کما رہا ہے۔ اس صورت میں اس کا فتویٰ قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ امام سندھی فقر غیور کا راستہ اپنانے کی دعوت دیتے ہیں اور دنیا نہ کمانے کو منفی عمل ٹھہراتے ہیں۔ امام سندھی صرف آیات واحکام پر غور وفکر کی دعوت نہیں دیتے وہ پورے قرآن مجید کی تفہیم کی دعوت دیتے ہیں وہ قرآن کے لفظ لفظ کو ہدایت ٹھہراتے ہیں اوران پر غور کی دعوت دیتے ہیں۔

اس کتابچے کے تیسرے باب میں امام سندھی قصص القرآن کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ شیخ اکبر ابن عربی نے فصوص الحکم میں قصص القرآن کی تعبیرات پیش کی ہیں۔ امام ولی اللہ دہلوی نے تاویل الاحادیث میں قصص قرآن کی نئی تعبیر پیش کی ہے۔ امام سندھی نے اسی عمل کو آگے بڑھایا ہے اور قرآن مجید سے فیض پانے اور زندگی کی تاریکی میں نور بھرنے کی دعوت دی ہے۔

امام سندھی نے اس کتابچے میں یہ واضح کیا ہے کہ قرآن مجید اعلیٰ کردار کی تشکیل کرتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے ھدی للمتقین کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ یہ دایہ اس جوان کی دودھ پلانے والی ہے اور مراد لیا جاتا ہے کہ اس دایہ کے دودھ سے یہ شخص بچے سے جوان ہوگیا، اسی طرح دعوت قرآن سے فیضیاب ہوکر کوئی بھی انسان متقی بن جاتا ہے۔ امام سندھی نے الہام الرحمٰن میں ایک روایت سے استفادہ کرتے ہوئے متقی کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ:

جو امر بالمعروف کرے، نہی عن المنکر کرے اور عدل قائم کرے۔

امام سندھی نے جس روایت سے یہ مفہوم اخذ کیا ہے اسے مسترد بھی کر دیا جائے تو یہی مفہوم مختلف آیات قرآنی سے بھی اخذ ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کی آیت یاد آئی:

اعدلو اھو اقرب للتقوی

امام سندھی نے اس کتابچے میں مختلف آیات اور احادیث سے مسلم کریکٹر اور متقی کریکٹر کی مختلف صفات واضح فرمائی ہیں۔ دراصل امام سندھی گمشدہ مسلم کردار کی تلاش میں نکلے تھے۔ اقبال نے کہا تھا:

میں کہ مری نوا میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
مری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

مولانا سندھی بھی یہی جستجو لیے نکلے تھے۔ اس کتابچے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مولانا سندھی کے نزدیک مسلم کردار اور متقی کردار کس قدر ضروری ہے۔ اس کی نظر میں یہی قرآن کا مقصود اولین تھا۔ یہی جناب رسالت مآب ﷺ کی بعثت کا مطلب بھی ہے۔

اس کتابچے کے چوتھے باب میں مولانا سندھی نے قرآن سے دوری کا سبب عجم کو ٹھہرایا ہے۔ اقبال تمام عمر عجم کے خلاف شعلہ فشاں رہے، مگر مولانا سندھی نے صرف اسی کتابچے میں عجم کا استرداد کیا ہے۔ اقبال نے تو خیر یہاں تک کہہ دیا تھا:

تمدن تصوف شریعت کلام
بتان عجم کے پجاری تمام

اور یہ بات اقبال ہی کہہ سکتے تھے:

ذراسی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے......

مگر حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ عرب نے اسلام کی دعوت کو آگے بڑھایا۔ عجم نے بھی اسلام کے فروغ و اشاعت میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر دیں۔ مولانا سندھی اس کتابچے میں عجم کو مجرم ٹھہرا رہے ہیں حالانکہ اسلام میں عجمیت کی آمیزش صرف افسانہ وافسوں ہے۔ ہاں اس میں عربیت کی جو آمیزش ہوئی وہ ایک ایسا واقعہ ہے جس پر فخر کیا جاتا ہے حالانکہ یہی بات باعث تشویش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے خیالات عقائد کا روپ دھار گئے:

الدعاء فی العربیه اسرع فی الاجابته

''عربی میں دعاء اجابت میں تیز تر ہوتی ہے''

امام سندھی نے زندگی کے آخری دور میں عربیت اور اسلام کو الگ الگ کیا اور یہ عظیم کارنامہ ہے۔ اسلام اور عربیت کو ایک کرنے کی بدعت محمد بن اسحاق کے عہد سے شروع ہوئی۔ بعد والوں نے مکھی پہ مکھی ماری اور یہ بات ہمارے عہد کے بزعم خویش اصل اسلام کے دعویداروں کا قابل فخر سرمایہ ہے۔

امام سندھی کے ۱۹۱۴ء کے اس کتابچے کو پڑھ کر راقم الحروف تو حیرت میں پڑ گیا تھا کہ یہ کتابچہ حیرت انگیز طور پر امام سندھی کے آخری دور کے خیالات سے مماثلت رکھتا ہے۔ چند باتوں کا غلط ہوجانا یا چند باتوں سے علیحدہ ہوجانا ایک معمولی سی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام سندھی کا امام ولی اللہ اور اپنے اساتذہ سے گہرا تعلق تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات کا سفر افقی رخ پر کم ہوا اور عمودی رخ پر زیادہ ہوا۔ ان کے خیالات میں تبدیلی کی بجائے گہرائی پیدا ہوئی۔

امام سندھی نے اپنی زندگی کے آخری دور میں حروف مقطعات اور متشابہات پر غور وفکر کی دعوت بھی دی اور قرآن مجید میں منسوخ التلاوت کا انکار بھی فرمایا۔ امام سندھی کے دور میں یہ دونوں باتیں بڑی انقلابی باتیں تھیں۔ امام سندھی نے جب یہ باتیں کہیں تو آپ ان دنوں مکہ معظّمہ میں تھے۔ مکی علماء ان باتوں سے بڑے ناراض ہوئے، مگر آپ نے متشابہات پر مباحث ان علماء کے ممدوح ابن تیمیہ کی تحریروں میں دکھائے تو وہ آپ کے حامی ہوگئے۔

امام سندھی نے فہم قرآن کے سلسلے میں ایک ایسی راہ دکھائی جو نئی تو تھی، مگر قرآن حکیم کے خلاف نہیں تھی۔ انہوں نے امام ولی اللہ دہلوی کے طرز فکر اور طرز عمل کو آگے بڑھایا۔ اب انہی کی باتیں دہرا کر لوگ دانشور بھی بن گئے اور مفکر بھی۔ ایک مفکر اسلام (بزعم خویش) نے پارہ عم کی تفہیم میں جگہ جگہ امام سندھی کے اقوال دہرائے ہیں، مگر یہ باتیں المقام المحمود کے بارے میں کرنے کی ہیں۔

امام سندھی نے قرآن فہمی کے سلسلے میں جو اصول وضع کیے وہ ان کے اتباع اور تلامذہ کے ہاں بآسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ استاذی شیخ القرآن مولانا محمد طاہر علیہ الرحمۃ نے ''العرفان'' میں امام سندھی کے اصولوں کو شیخ القرآن مولانا حسین علیؒ کے اصولوں سے ملا کر ایک نیا امتزاج پیش کیا ہے۔

آج جہاں جہاں دعوت قرآن نظر آتی ہے، وہاں وہاں امام سندھی کے افکار اور طرز فکر کی جھلک نظر آتی ہے۔ واقعی امام سندھی کی شبنم افشانی نے پورے گلزار کو زندگی بخش دی ہے۔

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا بن جائے گی

میں نے امام سندھی کے اس کتابچے پر مقدمہ لکھنے کا حریصانہ خیر مقدم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ میری اس سعی کو میرے لئے اور جمیع امت کیلئے، دارین میں سعادت وہدایت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

۲مئی۱۹۹۷ء

والسلام
امجد علی شاکر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

قرآن مجید کی تعلیم کا اثر

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ

گذشتہ کانفرنس منعقدہ آگرہ میں خاکسار نے ایک مضمون پڑھا تھا۔ جس میں زیادہ تر ان دو امور پر بحث کی گئی تھی کہ ہماری قوم کے جدید طبقے میں مذہبی تعلیم کی کس حد تک ضرورت ہے اور اس طبقے کی مذہبی تعلیم کے لئے کس قسم کے مضمون کی ضرورت ہے۔

اس مرتبہ میں قرآنِ مجید کے متعلق اپنی ناچیز رائے پیش کروں گا۔ یہ فقط قرآنِ مجید کی تعلیم کا اثر تھا کہ چند سال کے عرصہ میں عرب کے بت پرست دنیا میں سب سے زیادہ خدا پرست، سب سے زیادہ متمدن، سب سے زیادہ مہذّب اور سب سے زیادہ طاقتور بن گئے۔

اسی قرآن کی تعلیم نے ان میں نہایت جلد ایسے کامل ترین اخلاق پیدا کر دیئے کہ اگر ایک طرف چند سال کے عرصہ میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنتوں نے متفقہ طور سے ان کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا تھا، تو دوسری طرف وہ سب سے زیادہ خدا پرست بن گئے۔ جنگِ قادسیہ کے موقع پر جو ۱۵ھ میں ہوئی تھی۔ ایک ایرانی جرنیل نے کہا تھا کہ ’’ہم ان لوگوں سے مقابلہ نہیں کرسکتے۔ یہ رات کو فرشتے ہوتے ہیں اور دن میں شیر۔‘‘

اس تعلیم کے نتائج ظاہر ہونے سے پیشتر عربوں کی جو حالت تھی‘‘ اس کا اندازہ ایران کے شاہنشاہ یزدجرد کے ان خیالات سے ہوسکتا ہے جس کا اظہار فردوسی نے اس طرح کیا ہے

زشیرِ شُتر خوردن و سوسمار　　عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو　　تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو

(ترجمہ: اونٹنیوں کے دودھ اور گوہوں کے گوشت پر پلنے والے عرب اب تختِ شاہی کے طلبگار بن گئے ہیں، حیف ہے اے آسمان! تجھ پر حیف ہے!)

دنیا میں وہی حکومت کرتے ہیں جن کے اخلاق بہتر ہوتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم نے ان اونٹ چرانے والے عربوں کو نہایت جلد ایسے اخلاق سے مزین کردیا کہ ایران تو ایران رہا وہ تقریباً تمام دنیا کے مالک بن گئے۔ خدا کے احکام کی تعمیل کے لئے وقت اور مال کی تو حقیقت ہی کیا ہے۔ نہایت خوشی سے جان دینا بہترین کامیابی سمجھنے لگے: مثلاً دو واقعات پیش کرتا ہوں:

’’حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے ماموں، حرام کو ستر سواروں کے ساتھ روانہ کیا، پس پھر وہ پہنچے تو میرے ماموں نے ان سے کہا کہ میں تم سے پہلے جاتا ہوں اور اگر انہوں نے مجھے امان دی تو میں ان کو رسول اللہ ﷺ کا پیغام پہنچادوں تو خیر ورنہ تم میری مدد کے لئے قریب ہوجانا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھے اور انہوں نے ان کو پوری امان دے دی۔ لیکن جس وقت وہ رسول اللہ ﷺ کا پیغام پہنچا رہے تھے تو ان لوگوں نے اپنے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا تو اس نے ان کو ایک نیزہ مارا وہ نیزہ ان کے جسم کے پار ہوگیا۔ اس پر میرے ماموں نے کہا! اللہ اکبر! کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہوگیا ہوں۔

(۲) حضرت خبیبؓ کا واقعہ بخاریؔ اور ابوداوٗد میں مذکور ہے کہ جس وقت آپ کو حارث بن عامر بن نوفل کی اولاد نے شہید کیا تو آپ نے یہ شعر پڑھے۔

فلست ابالی حین اقتل مسلما　　علی ای شق کان للّٰہ مصرع
وذاک فی ذات الالٰہ وان یشأ　　یبارک علی اوصال شق ممزع

’’جب کہ میں مسلمان ہونے کی حالت میں قتل کیا جاتا ہوں تو مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ اللہ کے راستے میں کس پہلو پر گرتا ہوں۔ اور یہ اللہ کی راہ میں ہے کہ اگر وہ چاہے تو انہی جدا جدا ہوئے اعضاء کے جوڑوں میں برکت پیدا کردے گا۔‘‘

(ممکن ہے یہی کچھ کام کر جائیں)

عقلمند لوگوں نے اس تعلیم کے ظاہری نتائج پیدا ہونے سے پیشتر ہی اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ یہ تعلیم یقیناً ایسے کامل ترین اخلاق پیدا کرنے والی ہے کہ جن لوگوں پر اس کا اثر ہوگا خواہ وہ کیسے ہی غیر مہذب اور جاہل کیوں نہ ہوں، نہایت جلد دنیا میں بہترین اور قوی ترین بن جائیں گے۔

ہرقل کی دعوت کا واقعہ:

چنانچہ ۶ھ میں جب رسولِ کریم ﷺ نے روم کے بادشاہ ہرقل کو بذریعہ خط و کتابت دعوتِ اسلام دی تو اس نے ابوسفیان کو جو اتفاقاً اس وقت روم ہی میں تھا، بلاکر اسلامی تعلیمات اور رسولِ کریم ﷺ کے حالات دریافت کئے۔ حالات معلوم ہونے کے بعد ہرقل نے یہ الفاظ کہے:

ان یک ماتقول حقا فانه نبی ولیبلغنّ ملکه ماتحت قدمی

''جو کچھ تم کہتے ہو اگر یہ سچ ہے تو وہ یقیناً نبی ہے اور اس کی سلطنت ضرور میرے قدموں کے نیچے کی زمین تک پہنچے گی۔''

ہرقل کی یہ رائے بالکل صحیح ثابت ہوئی اور یہی تعلیم آج بھی قرآن میں موجود ہے۔ مگر آج ہم نہایت خراب حالات میں ہیں۔ تمام دنیا میں مسلمان نہایت پست اور کمزور ہیں اور ان کی اخلاقی اور روحانی حالت نہایت تیزی سے تنزّل کر رہی ہے۔ یہ نہایت عجیب اور حیرت انگیز بات ہے اور ہماری اس پست حالت کو دیکھ کر اکثر لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ ان کی مذہبی تعلیم کی بدولت ان کی یہ حالت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعمال تعلیم ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں چنانچہ اس بارے میں مصر کے اس صدی کے ایک نامور عالم نے لکھا ہے:

''اور کسی قسم کا تغیر تعلیم و تربیت کے بغیر نہیں ہوسکتا کیوں کہ تغیر سے مراد وہ تغیر ہے جس کا نتیجہ عمل کا تغیر ہے اور اعمال علوم اور اخلاق کے آثار ہیں تو پھر جب حق اور باطل اور مفاسد اور منافع اور مضار کا علم صحیح ہوگا اور اخلاق عمدہ ہونگے، تو اعمال بھی سب اچھے ہوں گے جو کہ قوم کے افراد کو اعلیٰ ترقی دیں گے اور مذہبی اور تمدنی کمالات تک پہنچادیں گے اور موجودہ تعلیم جس پر ہم چند صدیوں سے چل رہے ہیں، ایسے افراد پیدا کردیتی جو کہ ملتِ اسلامیہ کو ترقی پر پہنچادیتے اور اسے گوہ کے

بل سے نکال لیتے جس میں ہم مقید ہیں۔ تو ان کے آثار ظاہر ہوتے تو ہم اس ذلت کی حالت میں نہ رہتے جس میں ہم چند صدیوں سے مقید ہیں۔ گویا ہم فالج یا سکتہ کی بیماری میں مبتلا ہوگئے ہیں۔''

ہم تو مریض ہیں اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن شریف ذریعۂ شفا اور رحمت ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (بنی اسرائیل ۸۲)

''اور قرآن شریف کو ہم نے مومنوں کے لئے شفا اور رحمت کر کے بھیجا ہے۔''

تو پھر ہم شفایاب کیوں نہیں ہوتے؟ ہم مریض کیوں ہیں؟

ہماری مذہبی کتاب کی تعلیم تو ایسی ہے کہ غیر بھی اس کے ظاہری نتائج نکلنے سے پیشتر یہ رائے قائم کرلیتے ہیں کہ اس تعلیم سے ایسے نتائج نکلنے والے ہیں کہ اس سے جو متاثر ہوں گے وہ دنیا میں سب سے زیادہ مہذب، سب سے زیادہ متمدن، کامیاب اور قوی ہوں گے، خود وہ کتاب بھی ایسا ہی دعویٰ کرتی ہے۔ علاوہ اس کے نتائج بھی مشاہدے میں آچکے ہیں۔ اس تعلیم کے نتائج کا تجربہ بھی ہوچکا ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ یہ تعلیم اب بھی موجود ہے، پھر بھی ہم مریض ہیں، ہم پست ہیں، ہم کمزور ہیں!

یہ نہایت حیرت انگیز اور عجیب بات ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنا نہایت ضروری ہے اور اس پر ہماری حیات کا انحصار ہے۔ ضرورت ہے کہ اس اہم ترین مسئلہ پر قوم کے بہترین دماغ غور کریں تاکہ صحیح نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ اپنی بساط کے مطابق میں نے بھی اس مسئلہ پر غور کیا ہے اور جن نتائج تک پہنچا ہوں، پیش کرتا ہوں۔

مریض موجود ہو اور اکسیر موجود ہو۔ مسموم ہو اور تریاق موجود ہو اور مرض نہ جاتا ہو۔ زہر نہ جاتا ہو تو اس کی یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ یا تو اکسیر اور تریاق کا استعمال نہیں کیا جاتا یا اگر استعمال کیا جاتا ہے تو غلط طریقہ سے کیا جاتا ہے۔

دوا بھی تب نفع پہنچاتی ہے جب وہ صحیح طریقہ سے استعمال کی جائے۔ اگر غلط اور غیر مناسب طریقہ سے استعمال کی جائے تو وہی زہر بن جاتی ہے۔ جب ایک طرف خدا تعالیٰ قرآن کو ذریعۂ شفا فرماتا ہے تو دوسری طرف تجربہ نے بھی اس کو ایسا ہی ثابت کردیا ہے کہ ایک بدترین قوم کو جو نہایت خراب اور پست حالت میں تھی، مشرک، بت پرست اور خود پرست تھی، اس قوم کو چند سال میں بہترین قوم بنادیا۔ اس کے مہلک ترین امراض کو شفا

دے کر بہترین صحت عطا کر دی۔ اور اگر ہم باوجود اس تعلیم کے بدستور خراب حالت میں ہیں تو یہ لازمی ہے کہ یا تو ہم اس ذریعۂ شفاء کو استعمال نہیں کرتے یا اگر کرتے ہیں تو غلط اور غیر مناسب طریقہ سے استعمال کرتے ہیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ہماری تباہی کے یہی دو سبب ہیں۔ ہماری قوم کا ایک حصہ تو قرآن مجید سے بالکل ہی محروم ہے اور دوسرا حصہ اس تریاق کو غلط طریقہ سے استعمال کرتا ہے، اور اسی وجہ سے موجودہ خراب نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔ قوم کا جو حصہ قرآن کی تعلیم سے محروم ہے اس کے متعلق کسی قسم کی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ خراب حالت میں ہے تو کوئی تعجّب کی بات نہیں۔ جو دوا کو اور صحت کے طریقوں کو استعمال نہ کرے گا وہ تو مختلف امراض میں گھرا رہے گا ہی۔

اس وقت دوسرے حصے کی حالت پر غور کرنا ضروری ہے جو ایک بہترین تریاق کو غلط طریقہ سے استعمال کر کے اس کے فوائد سے محروم ہو رہا ہے۔

دریا رود از چشم لب ترنشود ہرگز
ایں طرفہ تماشا بیں لب تشنہ بہ آب اندر

(چشمہ سے پانی بہہ رہا ہو، اگر ہونٹ اسے لگائے ہی نہیں جائیں گے تو وہ تر کیسے ہونگے؟!)

تعلیم قرآن کا صحیح طریقہ:

قبل ازیں کہ ہم اس پر غور کریں کہ قوم کا ایک حصہ قرآن کی تعلیم کو کن کن غلط طریقوں سے استعمال کر کے اس کے فوائد سے محروم ہے، بہتر ہے کہ ہم یہ دریافت کر لیں کہ قرآن کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ اس کے بعد فیصلہ کرنے میں ہمیں آسانی ہوگی۔ جب کوئی طبیب کوئی نسخہ لکھتا ہے تو طریقۂ استعمال بھی ضرور بتا دیتا ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ قرآن کی تعلیم کا صحیح طریقہ ہمیں قرآن میں ہی ملنا چاہیئے۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا

اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ

اس کو کما حقہ پڑھتے ہیں اور وہی اس پر ایمان لاتے ہیں۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (البقرہ۔ ۱۲۱)

اور جو لوگ اس کا انکار کریں گے وہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (الاعراف ۱۷۶)

ان کو قصے سناؤ تاکہ وہ غور کریں۔

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (یونس ۲۴)

غور کرنے والوں کے لئے ہم اس طرح آیات تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَي النَّاسِ عَلٰي مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (بنی اسرائیل ۱۰۶)

اور قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اس مصلحت سے اتارا کہ تم وقتاً فوقتاً مہلت کے ساتھ اسے لوگوں کو پڑھ کر سناؤ اور اسی مصلحت سے ہم نے اسے رفتہ رفتہ اتارا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (الانبیأ ۱۰)

لوگو! ہم نے تمہاری طرف (یہ قرآن) ایسی کتاب اتاری ہے جس میں تمہارا ذکر ہے کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ (سورہ طہٰ ۱۱۴)

اور اے پیغمبر! تمہاری طرف جو قرآن وحی کیا جاتا ہے، وحی کے تمام ہونے سے پہلے قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (الروم ۵۸)

اور ہم نے لوگوں کے سمجھانے کے لئے اس قرآن میں سب ہی طرح کی مثالیں بیان کر دی ہیں تاکہ یہ لوگ نصیحت پکڑیں۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر ۱۷)

اور ہم نے قرآن کو لوگوں کے نصیحت پکڑنے کیلئے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ نصیحت پکڑے؟

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ (النساء ۸۲)

کیا ان لوگوں نے ہمارے ارشاد (یعنی قرآن) میں غور نہیں کیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (الفرقان ۳۲)

اور کافر کہتے ہیں کہ اس پیغمبر کا قرآن سارے کا سارا ایک دم کیوں نہیں نازل کیا گیا

ہم کہتے ہیں کہ جیسا وقتاً فوقتاً اترا ہے ایسا ہی اترنا چاہیے تھا اور اے پیغمبر! اس میں مصلحت ہے کہ ہم وقتاً فوقتاً اس کے ذریعہ سے تمہارے دل کو تسکین دیتے رہیں اور اس وجہ سے ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر اتارا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (الفرقان ۷۳)

اور نیز وہ لوگ کہ جب ان کو ان کے پروردگار کی آیتیں سنا سنا کر نصیحت کی جائے تو اندھے اور بہرے ہو کر ان پہ نہ گریں۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص ۲۹)

کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تا کہ لوگ ان کی آیتوں میں غور کریں اور جو عقل رکھتے ہیں اس کے مطالب سے نصیحت پکڑیں۔

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (الزخرف ۳)

ہم نے اس کو صاف اور سلیس عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تا کہ تم اس کو بآسانی سمجھو۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (الدخان ۵۸)

پس ہم نے اس کو تیری زبان میں آسان کیا ہے تا کہ وہ نصیحت پکڑیں۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۞ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ (الزخرف ۴۳-۴۴)

تو اے پیغمبر! قرآن جو تمہاری طرف نازل (وحی) کیا گیا ہے اس کو خوب مضبوط پکڑے رہو، اس میں شک نہیں کہ تم سیدھے راستے پر ہو اور یہ قرآن تمہاری اور تمہاری قوم کے لئے نصیحت ہے، اور آگے چل کر تم سب سے اس کی بابت باز پرس ہوگی

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (سورہ محمد ۲۴)

کیا یہ لوگ قرآن کے مطالب کو نہیں سوچتے یا دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (النساء ۲۷)

اللہ چاہتا ہے کہ (انبیاء اور صلحاء) جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں ان کے طریقے تم سے کھول کھول کر بیان کرے اور تم کو انہیں طریقوں پر چلائے اور تم پر مہر کی نظر رکھے اور اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۲۱)

اور مسلمانو! تمہارے لئے پیروی کرنے کے لئے رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے۔

کلامِ مجید میں جو طریقہ اس کو پڑھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا ہے وہ صاف طور پر ان آیات میں درج ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) قرآنِ مجید نہایت غور و خوض سے پڑھو اور سمجھو۔ پوری طرح سے اس میں فکر کرو، تدبر کرو۔

(۲) جو کچھ پڑھو اس کے مطابق صحیح عمل کرو کیونکہ تمہاری پیدائش کا مقصد عمل ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ (الملک ۲)

اللہ تعالیٰ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تم لوگوں کو آزمائے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (النساء ۲۷)

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ (انبیاء وصلحاء) جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں ان کے طریقے تم سے کھول کھول کر بیان کرے اور تمہیں انہیں طریقوں پر چلائے۔

۲۔ اور کلامِ مجید کی تعلیم پر عمل کرنے میں رسول اللہ ﷺ کو بطور نمونہ پیش رکھو۔ کسی تعلیم پر عمل کرنے میں آسانی اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ اس پر عمل کا مجسم نمونہ پیشِ نظر رہے، تا کہ مختلف لوگ مختلف طریقۂ عمل اختیار نہ کریں اور افراط و تفریط سے محفوظ رہیں۔ خود قرآن میں قرآن کی تعلیم کا طریقہ بالکل صاف طور سے بتا دیا گیا ہے اور جناب رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ اسی طریقہ پر کاربند ہوئے اور پورے کامیاب ہوئے۔

حضور پرنورؐ قرآنِ مجید پر بے انتہا غور فرماتے تھے۔ بعض اوقات صرف ایک آیت کو بار بار تلاوت فرماتے تھے یہاں تک کہ پوری رات گذر جاتی تھی اور صبح ہو جاتی تھی۔ امام ابن قیم اپنی کتاب زاد المعاد کی پہلی جلد صفحہ نمبر ۹۰ پر تحریر فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ سورۃ کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے یہاں تک کہ ایک معمولی سورۃ بڑی سے بڑی سورۃ ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ ایک ہی آیت پر ٹھہر جاتے تھے اور اسی کو بار بار صبح تک پڑھتے رہتے تھے۔

تعلیمِ قرآن کے بارے میں صحابہ کرامؓ کی آراء اور تعامل

حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

”آہستہ پڑھنا اور غور کرنا جس میں قرآن شریف اگرچہ تھوڑا پڑھا جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ جلدی پڑھا جائے۔ کیونکہ پڑھنے سے مقصود سمجھنا اور غور کرنا ہے تاکہ اس پر عمل ہو سکے اور اس کا پڑھنا اور یاد رکھنا معانی تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ چنانچہ ایسا ہی بعض سلف نے کہا ہے کہ قرآن شریف اس لئے نازل ہوا ہے تاکہ اس پر عمل کیا جائے مگر انہوں نے اس کی تلاوت کو ایک مستقل عمل بنالیا۔ اسی لئے گذشتہ طبقات میں اہلِ قرآن وہی سمجھے جاتے تھے جو قرآن شریف کے عالم اور عامل تھے، اگرچہ ان کو زبانی حفظ نہ بھی ہوتا تھا لیکن جس شخص نے قرآن کو یاد کیا اور اس کے مطالب نہ سمجھے، نہ ان پر عمل کیا تو وہ اہل قرآن میں سے نہیں ہے اگرچہ اس کے حروف کو تیر کی طرح اس نے درست کرلیا۔ اور مختصر تلاوت جو کہ فہم اور تدبر سے خالی ہو اس کو تو ہر نیک و بد، مومن اور منافق کرسکتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو منافق قرآن شریف پڑھتا ہے اس کی مثال ریحان کی سی ہے کہ اس کی بو عمدہ ہے اور مزہ کڑوا ہے۔“

”شعبہ نے کہا ہے کہ ابوحمزہ نے ہم سے بیان کیا کہ میں نے ابنِ عباس سے کہا کہ میں تیز پڑھنے والا ہوں۔ بعض اوقات ایک رات میں ایک یا دو مرتبہ قرآن ختم کرلیتا ہوں۔ ابن عباس نے کہا کہ مجھے اس طرح قرآن پڑھنے سے ایک سورۃ پڑھنا بہتر معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال اگر تم تیزی سے ہی پڑھنا چاہتے ہو تو بھی ایسے پڑھو کہ تمہارے کان سنیں اور تمہارا دل اسے یاد کرلے۔

”ابن مسعود نے فرمایا ہے کہ: قرآن شریف کے عجائب پر ٹھہرو اور ان سے دلوں میں رقت پیدا کرو اور تمہاری یہ کوشش نہ ہو کہ خوامخواہ آخری سورۃ تک پہنچو۔“

”عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے کہا کہ میں ایک عورت کے ہاں گیا اور میں سورۃ ہود پڑھ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اے عبدالرحمٰن تم اس طرح سورہ ہود پڑھتے ہو، خدا کی قسم میں چھ مہینے سے سورۃ ہود پڑھ رہی ہوں اور اب تک اس سے فارغ نہیں ہوئی۔“

حضرات صحابہ کرام ؓ ایک طرف تو قرآنِ مجید پر اس قدر غور کرتے تھے اور دوسری طرف اس پر پورا عمل فرماتے تھے۔ قرآن شریف کو اس طرح پڑھتے تھے کہ پہلے دس آیتیں

پڑھیں اور ان پر عمل کیا پھر اس کے بعد دس آیتیں پڑھیں اور ان پر عمل کیا اور پھر اس کے بعد دس آیتیں پڑھتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے۔ فقط پڑھنے اور سمجھنے کو ہی مقصود نہیں بنایا تھا۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں ہے:

”اعمش نے ابن وائل سے روایت کی ہے اور وہ ابن مسعود سے روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہم میں سے دس آیتیں سیکھ لیتا تھا تو اس سے زیادہ نہ پڑھتا تھا جب تک ان کے معانی سمجھ نہ لیتا ان پر عمل نہ کرتا۔“

ابوعبدالرحمٰن سلمی نے فرمایا ہے کہ ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا ہے جو ہم کو پڑھاتے تھے کہ وہ آنحضرت ﷺ سے پڑھا کرتے تھے اور جس وقت دس آیتیں پڑھ لیتے تھے تو ان سے تجاوز نہ کرتے تھے جب تک کہ ان پر عمل نہ کرتے تھے۔ لہٰذا ہم نے قرآن اور اس پر عمل دونوں اکٹھے سیکھے تھے۔

اس کے ساتھ ہی حضرات صحابہ کرامؓ اس پر غور کرتے تھے کہ قرآن کی تعلیم سے پہلے ان کی حالت کیا تھی اور اس تعلیم کے اثر سے ان کی حالت کیا ہوگئی؟ اپنی حالتوں کا موازنہ کرتے تھے اور قرآن کی تعلیم سے جو اثرات ان پر ہوتے تھے، ان کا پورا اندازہ کرلیتے تھے۔ چنانچہ سیرت ابن ہشام جلد اول ص ۱۱۶ میں درج ہے کہ جب حبش کے بادشاہ نجاشی نے حضرت جعفر بن ابی طالب کو دربار میں بلایا اور ان سے اسلامی تعلیم کے بارے میں دریافت کیا اور کہا کہ تم نے اپنے مذہب کو چھوڑ کر کیوں اسلام اختیار کیا ہے تو آپ نے فرمایا:

”اے بادشاہ! ہم جاہل تھے اور بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے اور بے حیائی کے کام کیا کرتے تھے۔ قطع رحمی کیا کرتے تھے اور ہمسایوں سے برائی کرتے تھے اور ہم میں سے قوی، ضعیف کو کھا جاتا تھا۔ ہم اس حالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف رسول بھیجا جس کے نسب امانت اور پاک دامنی سے ہم خوب واقف ہیں۔ اس نے ہمیں توحید کی دعوت دی تاکہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور ہم اور ہمارے آباء پہلے جن بتوں اور پتھروں کی عبادت کیا کرتے تھے ان کو چھوڑ دیں۔ اور اس نے ہمیں سچ بولنے اور امانت ادا کرنے اور صلہ رحمی کرنے اور ہمسایوں کے ساتھ نیکی کرنے اور محرمات اور خونریزی سے بچنے کا حکم دیا اور جھوٹی باتوں اور یتیموں کا مال کھانے اور عفیف عورتوں کو تہمت لگانے سے منع کیا

اور اس کا حکم دیا کہ ایک ہی خدا کی پرستش کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ہمیں نماز اور زکوٰۃ اور روزے کا حکم دیا۔'' (حضرت جعفر بن ابی طالب نے سب اسلامی کام نجاشی کو گن کر سنائے اور اس کے بعد کہا کہ) ''ہم نے اس نبیؐ کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لائے اور جو کچھ وہ خدا کی طرف سے لایا ہے ہم نے سب کو تسلیم کیا اس لئے ہم صرف ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں اور کسی کو اس کا شریک نہیں بناتے جو چیز اس نے حرام کی ہے اس کو حرام سمجھتے ہیں۔ اس پر ہماری قوم ہماری دشمن بن گئی اور اس نے ہمیں عذاب دیا اور دین کی وجہ سے تکلیفیں دیں تا کہ ہمیں خدا کی عبادت سے بتوں کی عبادت کی طرف پلٹ دیں۔''

قرآن کی تعلیم کا طریقہ خود قرآن شریف سے اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے عمل سے بالکل واضح ہے۔ اب آپ ہی فیصلہ فرمائیں کہ ہم کس قدر اس طریقۂ تعلیم کے مطابق قرآن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب اگر وہی نتائج پیدا نہیں ہوتے تو کیا تعجب کی بات ہے۔ اگر وہ نتائج آپ چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اسی طریقہ سے قرآن مجید سے فائدہ اٹھائیں۔ ہماری نجات اسی طریقہ پر منحصر ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بالکل صحیح فرمایا ہے۔

لایصلح اخر ھذہ الامۃ الابما صلح اوّلھا

''اس امّت کے آخری حصہ کی اصلاح فقط اسی چیز سے ہوگی جس سے اوّل کی ہوئی۔''

اب ہمیں اس پر غور کرنا ہے کہ اس صحیح طریقہ کے چھوڑنے سے قرآن کی اصلی تعلیم میں کون سے نقص پیدا ہو گئے ہیں تا کہ ان کی تلافی کرنے میں خاص طور سے سعی کی جائے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ غلط طریقۂ تعلیم سے ہم قرآن کے صحیح مطالب سے کس قدر دور ہو گئے ہیں۔

ایک حصہ قوم کا تو قرآن پڑھتا ہی نہیں، بالکل محروم ہے لہٰذا اس کو اس تعلیم سے بعد ہے اور اس طبقہ کے بارے میں کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ دوسرا طبقہ جو اپنے آپ کو قرآن کی طرف متوجہ سمجھتا ہے وہ بھی قرآن سے صحیح طریقے پر مستفید نہ ہونے کی وجہ سے اس کے صحیح مطالب سے دور ہو چکا ہے اور دور ہوتا جاتا ہے۔ اس طبقے میں سے ایک حصہ تو قرآن کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا بلکہ نقل الفاظ کو ہی کافی سمجھتا ہے۔ چنانچہ

ہمارے اکثر مکاتب میں یہی رنگ ہے۔ اس طبقے کا دوسرا حصہ اگرچہ قرآن شریف کے مطالب سمجھنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ وہ ان کے سمجھنے کے مقدّمات ہی میں الجھا رہتا ہے اور قرآن شریف پر غور کرنے کی طرف نہ تو توجہ کرتا ہے اور نہ اسے اس کا وقت ہی مل سکتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ جو علمائے ہند کے امام ہیں اپنی نادر کتاب تفہیماتِ الٰہیہ میں اسی طبقے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

قرآن کے غلط طریقۂ تعلیم کے نتائج اور شاہ ولی اللہؒ کی رائے:

''اور میں طالب علموں سے کہتا ہوں کہ اے بے وقوفو! جو خود کو علماء کا خطاب دیتے ہو! تم یونانیوں کے علوم میں مشغول ہو گئے ہو اور صرف اور نحو میں پھنس گئے ہو اور تمہارا خیال یہ ہے کہ یہ حقیقی علم ہے۔''

اس کے بعد ایک موقعہ پر ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید سمجھنے کے لئے جن مقدّمات کی ضرورت ہے ان کو بقدر ضرورت سیکھا جائے نہ کہ ان کو مستقل درجہ دے دیا جائے۔

''علومِ آلیہ میں شغل محض آلہ ہونے کی حیثیت سے کیا جائے نہ کہ اس لحاظ سے کہ وہ مقصود بالذّات ہیں۔''

اور چونکہ یہ طبقہ صرف ونحو، منطق، کلام، معانی اور بدیع وغیرہ میں تکمیلِ فنون کے لئے تقریباً تمام وقت صرف کر دیتا ہے اس لئے اصل قرآن کی طرف توجہ کرنے کا موقع ہی اس کو نہیں ملتا۔ اور جس قدر قلیل، اقل حصہ اپنی تعلیم کا زمانہ قرآن شریف کی تعلیم میں صرف کرتا ہے وہ بھی مفسرّین کے مختلف خیالات معلوم کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔ یہ رنگ ہمارے عربی مدارس میں پایا جاتا ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ آج خالص قرآن کی تعلیم ہی کہیں نہیں دی جاتی۔ جو لوگ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم ہوتی ہے، حقیقت میں وہ قرآن کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ تفسیرِ قرآن کی تعلیم ہوتی ہے۔ دراصل قرآن کی تعلیم اور تفسیر قرآن کی تعلیم علیحدہ علیحدہ ہیں، ایک چیز نہیں۔ قرآن خود ایک مستقل کتاب ہے اور صاف سلیس عربی میں ہے۔ خدا تعالیٰ قرآن کے بارے میں فرماتا ہے:

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (الدخان ۵۸)

''ہم نے اس کو تیری زبان میں آسان کیا ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾ (القمر ۱۷)

"اور ہم نے قرآن کو، لوگوں کی نصیحت پکڑنے کے لئے آسان کر دیا ہے، تو کوئی ہے کہ نصیحت پکڑے۔"

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۲۸﴾ (الزمر ۲۸)

"یہ قرآن صاف سلیس عربی زبان میں ہے۔ اس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں۔ تاکہ اس کو سمجھ کر خدا سے ڈریں۔"

قرآن اور تفسیر کے متعلق شاہ اسماعیل شہیدؒ کی رائے:

"جو شخص عربی جانتے ہوں وہ اس کو کچھ سمجھ سکتے ہیں اور اگر ساتھ ہی رسولِ کریم ﷺ کا نمونہ پیشِ نظر رکھیں، جس کا حکم خود قرآن میں ہے اور جو صحیح احادیث کے ذریعہ سے بالکل محفوظ ہے، تو انہیں کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں ہے اور وہ بالکل صحیح طور پر قرآن شریف کو سمجھ سکتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کر سکتے ہیں اور جو لوگ عربی نہیں جانتے ان کے لئے بہترین ترجمے موجود ہیں وہ ان کے ذریعہ سے سمجھ سکتے ہیں لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم قرآن نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے سمجھنے کے لئے بہت سے علوم وفنون کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور بڑے عالم ہونے کی ضرورت ہے۔" چنانچہ شاہ اسماعیل صاحب شہیدؒ نے کتاب تقویۃ الایمان ص ۳۰ میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اس زمانہ میں دین کے حوالے سے جو لوگ کئی راہیں چلتے ہیں: کوئی پہلوں کی رسموں کو پکڑتے ہیں کوئی قصے بزرگوں کے دیکھتے ہیں اور کوئی مولویوں کی باتوں کو جو انہوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکالی ہیں، سند پکڑتے ہیں اور یہ عوام الناس میں مشہور ہے کہ اللہ اور رسول کا پیغام سمجھنا بہت مشکل ہے اس کیلئے بڑا علم چاہیے۔ ہم کو وہ طاقت کہاں ہے کہ ان کا کلام سمجھیں اور اس راہ پر چلنا بڑے بڑے بزرگوں کا کام ہے۔ سو ہماری کیا مجال کہ اس کے موافق چلیں بلکہ ہم کو یہی باتیں کفایت کرتی ہیں! سو یہ بات بہت غلط ہے۔ اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قرآن شریف میں باتیں بہت صاف وصریح ہیں، ان کا سمجھنا مشکل نہیں۔ اور اللہ ورسول کے کام کو سمجھنے کے لئے بہت علم نہیں چاہیے کہ پیغمبر تو نادانوں کو راہ بتانے کو اور جاہلوں کو سمجھانے کو اور بے علموں کو علم سکھانے کو آئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ

نے سورۂ جمعہ میں فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲﴾ (الجمعہ ۲)

"وہ (خدا) ہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے پیغمبر بنا کر بھیجا۔ وہ ان کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے ورنہ اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔"

سو جو کوئی یہ آیت سن کر یہ کہنے لگے کہ پیغمبر کی بات سوائے عالموں کے کوئی سمجھ نہیں سکتا اور ان کی راہ پر سوائے بزرگوں کے اور کوئی نہیں چل سکتا، تو اس نے اس آیت کا انکار کیا۔ اس بات کی مثال یہ ہے کہ جیسے بڑا حکیم ہو اور ایک بہت بیمار۔ پھر کوئی شخص اس بیمار سے کہے کہ فلاں حکیم کے پاس جانا اور اس سے علاج کروانا، اور بیمار کہے یہ تو بڑے بڑے تندرستوں کا کام ہے، مجھ سے یہ کیوں کر ہو سکتا ہے، میں تو سخت بیمار ہوں! سو وہ بیمار احمق ہے اور اس حکیم کی حکمت سے انکار کرتا ہے۔ اس واسطے کہ حکیم تو بیماروں ہی کے علاج کے واسطے ہے اور جو تندرستوں کا علاج کرے اور انہیں کو اس کی دوا سے فائدہ ہو اور بیمار کو کچھ فائدہ نہ ہو تو وہ حکیم ہی کیسا؟!

افسوس! ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن تو ہم سمجھ نہیں سکتے البتہ مختلف حضرات نے اپنے اپنے خیالات کے لحاظ سے جو شرحیں (تفسیریں) قرآنِ کریم کی لکھی ہیں۔ وہ ہم سمجھ سکتے ہیں اور انہی کو سمجھنا اور ان شرحوں کے سمجھنے کی کوشش کو لوگوں نے قرآن کی تعلیم سمجھ رکھا ہے۔ اگر یہ شرحیں اور تفاسیر ہوتیں کہ فقط قرآنِ مجید کا صحیح حق ادا کرتیں تو اس میں کوئی نقصان نہ ہوتا۔ لیکن غضب تو یہ ہے کہ مختلف لوگوں نے مختلف زمانوں میں، ماحول کے مختلف اثرات سے متاثر ہو کر جو طرح طرح کی باتیں اپنی شرحوں اور تفاسیر میں ایسی درج کی ہیں کہ جن میں اور قرآن میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے، لوگ ان باتوں کو قرآن کی تعلیم سمجھنے لگے ہیں۔ اور حقیقت میں وہ قرآن کی تعلیم سے کوئی علاقہ نہیں رکھتیں۔

دوسرا باب

مختصر تاریخ تفسیر

یہ بات واضح کرنا ضروری ہے اور اسی لئے میں قرآن کی شرحوں کا ابتدائی اور انتہائی مختصر خاکہ بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ شروع میں رسولِ کریم ﷺ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں قرآن مجید کے لئے کسی خاص شرح کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ قرآنِ مجید عربوں کی مادری زبان میں تھا۔ اس کو وہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ البتہ جب مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور کثرت سے عجمی لوگ مسلمان ہونا شروع ہوئے تو چونکہ ان کی مادری زبان عربی نہ تھی اس لئے انہیں قرآن سمجھنے میں دقت شروع ہوئی اس دقت کے رفع کرنے کے لئے جہاں جہاں قرآنِ مجید کی عبارت میں عجمیوں کے لئے اشکال سمجھے گئے ان کے مطالب کو دوسرے ایسے الفاظ اور جملوں کے ذریعے سے واضح کیا جانے لگا جن کو نسبتاً سمجھا جا سکے۔

صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ان تفسیری جملوں وفقروں کو کسی کتاب کی شکل میں لکھنے کی مطلق ضرورت نہیں سمجھی گئی بلکہ جو حضرات قرآنِ مجید کی تعلیم دیتے تھے وہ تعلیم دینے کے وقت جہاں ضرورت ہوتی تھی ایسے الفاظ اور فقرے استعمال کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ تک کے زمانہ میں ان تفسیری الفاظ اور جملوں کی زیادہ ضرورت ہوئی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے ایسے تفسیری جملے صرف چند مروی ہیں۔ صاحب کشف الظنون جلد۲ صفحہ ۳۳۲ میں لکھتے ہیں:

والروایۃ عن ثلاثۃ فی ندرۃ جداً۔ ان تینوں سے بہت ہی تھوڑی روایت ہے۔ سب سے زیادہ تفسیری جملے صحابہؓ میں سے حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہیں۔ کیونکہ آپ چھوٹے صحابہؓ میں سے تھے اور آپ کی وفات ۶۸ھ میں ہوئی ہے اور اس عرصہ میں کثرت سے

عجمی لوگ مسلمان ہو چکے تھے اور بوجہ عجمی ہونے کے ان کو ایسے تفسیری جملوں اور الفاظ کی زیادہ ضرورت تھی۔ لیکن بہت افسوس ہے کہ بہت سے جھوٹے راویوں نے اپنی طرف سے تفسیری فقرے اور جملے بنا کر حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کر دیئے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے بعد تابعین نے قرآن شریف پڑھانا شروع کیا اور اس تعلیم کے دو مرکز ہو گئے: ایک مکہ اور دوسرا کوفہ۔ مکہ میں حضرت ابن عباس کے شاگرد مثلاً مجاہد اور سعید بن جبیر۔ عکرمہ طاؤس بن کیسان، عطاء بن ابی ریاح قرآن کی تعلیم خصوصیت سے دیتے تھے اور کوفہ میں حضرت ابن مسعودؓ کے شاگرد مثلاً علقمہ بن قیس اسود بن یزید، ابراہیم نخعی اور شعبی وغیرہ۔

حضرات تابعین کے زمانہ میں بھی قرآنِ مجید کے مطالب سمجھانے والے تفسیری الفاظ اور فقروں کو لکھوانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ بلکہ قرآن کی تعلیم کے وقت وہ استعمال کئے جاتے تھے۔

حضرات تابعین کے بعد ان کے شاگردوں نے صحابہ اور تابعین کے ان تفسیری الفاظ اور فقروں کو لکھنا شروع کر دیا۔ جن حضرات نے خصوصیت سے یہ الفاظ اور فقرے جمع کئے ہیں ان کے نام یہ ہیں: سفیا بن عیینہ، وکیع بن الجراح، شعبہ، یزید بن ہارون، عبدالرزاق ابن ابی ایاس، اسحٰق بن راہویہ، روح بن عبادہ، عبید بن حمید اور ابی بکر بن ابی شیبہ۔

اگر یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہتا تو نہایت مفید ہوتا اور آج قرآن کی اصل تعلیم صحیح رنگ میں جاری رہتی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس طبقے کے بعد ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی شرحوں میں قرآنِ مجید کے صحیح مطالب کو پوری طرح پیش نظر نہیں رکھا بلکہ بہت سی غیر صحیح باتیں بھی اپنی شرحوں میں درج کر دیں اور مختلف تفسیروں کی کتابیں ایسی لکھنی شروع کیں، جن میں قرآن کے کچھ حصے کے صحیح اور کچھ حصے کے غیر صحیح مطالب موجود تھے۔

ان کے بارے میں صاحب کشف الظنون جلد۲ صفحہ ۳۳۶ میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس کے بعد متاخرین میں سے ایک جماعت نے تفسیریں تالیف کیں اور سندوں کو مختصر کر دیا۔ اور بہت سے اقوال نقل کر دیئے۔ یہاں سے زائد باتیں داخل ہونے لگیں اور صحیح اور ضعیف آپس میں ملتبس ہو گئیں۔ اس کے بعد جس کسی کو کوئی بات معلوم ہوئی وہی درج کر دی اور جو کچھ اس کے خیال میں آیا اسی پر اعتماد کر لیا۔ اس کے بعد ہر ایک پچھلا طبقہ اپنے متقدمین سے نقل کرنے لگا اس خیال

سے کہ کوئی نہ کوئی ضرور ان کی اصلیت ہوگی اور انہوں نے اس کی تحقیق نہیں کی کہ سلف صالحین سے اس میں کیا منقول ہے۔‘‘

ان تفسیروں میں کلامِ مجید کے الفاظ کے جس حد تک غیر صحیح معانی درج ہونے لگے۔ اس کا اندازہ علامہ سیوطی کے الفاظ سے ہوسکتا ہے:

’’میں نے غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کی تفسیر میں دس مختلف قول دیکھے ہیں حالانکہ رسول اللہ ﷺ اور سب صحابہ کرامؓ اور تابعین سے یہود و نصاریٰ کے سوا اور کچھ مروی نہیں ہے۔‘‘

مفسّر کے اس طبقہ کے بعد ایک دوسرا طبقہ پیدا ہوا جنہوں نے اپنی کتابوں میں قرآنِ مجید کے غیر صحیح مطالب ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے قرآنِ مجید کے مطالب کو صرف اس فن میں محصور کرنے کی کوشش کی جس کو وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ مثلاً جس کو نحو اچھی طرح آتی تھی، اس نے اپنی تفسیر میں کلامِ مجید کے صحیح مطالب کو پیش کرنے کی جگہ ساری قوت قرآن کی آیتوں کے نحوی نکات بیان کرنے اور ان پر بحث کرنے اور نحو کے مسائل نقل کرنے میں صرف کردی اور اسی طرح ان تفاسیر کا پڑھنے والا صرف یہ سمجھ سکتا ہے کہ گویا قرآن شریف صرف علم نحو ہی کی تعلیم کی غرض سے نازل ہوا ہے۔ مثلاً اس قسم کی ایک تفسیر میں بجائے اس کے کہ بسم اللہ کا صاف مطلب واضح کردیا جاتا، اس کے پڑھنے کی تین ہزار ترکیبیں درج کردی ہیں۔ اس بارے میں بجائے اس کے کہ میں خود کچھ کہوں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ کشف الظنون کی حسب ذیل عبارت نقل کردوں، یہ عبارت اس بات کو واضح کردے گی: (کشف الظنون جلد۲ص ۳۴۷)

’’اس کے بعد ایسے لوگوں نے تصنیف کی جنہوں نے کسی ایک علم میں قوت حاصل کی ہے اور اپنی کتاب کو اسی فن سے بھر دیا ہے جو اس کی طبیعت میں غالب تھا اور محض اسی پر اکتفا کیا جس میں کہ اسے مہارت حاصل تھی، گویا کہ قرآن صرف اسی علم کے لئے نازل ہوا تھا باوجودیکہ اس میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔ نحوی کو فقط اعراب اور وجوہ ترکیب ہی مدنظر رہتی ہیں اگرچہ وہ بعید ہی کیوں نہ ہو اور وہ نحو کے قواعد اور مسائل اور فروع اور اختلافات ہی کو داخل کرے گا۔ جس طرح کہ زجاج اور واحدی نے بسیط، اور ابوحیان نے بحر اور نہر میں کیا ہے اور اخباری کو محض قصے

اور ان کی تکمیل ہی مدنظر رہتی ہے اگرچہ گذشتہ قصے خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط۔ ثعلبی بھی ایسے حضرات ہی میں سے ہیں۔ اور فقیہ کا بھی مطلب ہوتا ہے کہ ساری فقہ داخل کردے۔ بسا اوقات فقیہ فروعات فقہ کی دلیلیں لے آتا ہے حالانکہ ان کو نفسِ آیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور پھر ان دلیلوں کے مخالفین کے جوابات بھی نقل کردیتا ہے۔ ایسے حضرات میں قرطبی ہیں اور صاحبِ علومِ عقلیہ خصوصاً امام اور فلاسفروں کے اقوال سے بھر دیا ہے اور کہاں سے کہاں تک چلے جاتے ہیں جس کے دیکھنے والا متعجب ہوجاتا ہے۔ ابوحیان نے بحر میں کہا ہے کہ: امام رازی نے اپنی تفسیر میں بہت سی چیزیں ایسی درج کی ہیں جن کی علم تفسیر میں کچھ ضرورت نہ تھی۔ اس لئے بعض علماء نے فرمایا ہے کہ امام رازی کی تفسیر میں سب کچھ ہے مگر تفسیر نہیں۔ اور ایک بدعتی کی غرض محض آیتوں کی تحریف ہی ہوتی ہے، تاکہ ان کو اپنے فاسد مذہب پر منطبق کرے، یہاں تک کہ اگر اس کو کوئی دور کی بات بھی سوجھتی ہے تو اسے لے لیتا ہے یا اگر کوئی ایسا موقعہ پاتا ہے جس میں اس کی بات کچھ بھی بن سکے تو فوراً بنالیتا ہے اور ملحد کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ خدا کی نسبت جھوٹ بناتا ہے جو خدا تعالیٰ نے مطلقاً نہیں فرمایا اور جو لوگ قرآن شریف میں بلا سند یا سلف صالحین کے اقوال کے ماسواء اور قواعدِ عربیہ اور اصول شرعیہ کی رعایت کے بغیر کچھ کہتے ہیں وہ سب اسی قسم میں سے ہیں۔ محمود بن حمزہ کرمانی کی تفسیر دو جلدوں میں اسی قسم کی ہے جس کا نام اس نے ’’العجائب والغرائب‘‘ رکھا ہے۔ اس میں بہت سے قول نقل کئے ہیں۔ جو عوام کے نزدیک عیب ہیں اور سلف کے طریقے سے بہت دور ہیں۔ بلکہ وہ ایسے ہیں کہ ان پر اعتقاد ہی ناجائز ہے اور ان کا ذکر کرنا سوائے تحذیر کے ناجائز ہے۔ بلقینی سے ایسے لوگوں کی نسبت فتویٰ پوچھا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ایسے لوگ مفتر و ملحد ہیں اور قرآن کے بارے میں صوفیاء کا کلام تفسیر نہیں ہے۔ ابن الصلاح نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے کہ میں نے امام واحدی سے معلوم کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ سلمیٰ نے حقائق التغیر تصنیف کی ہے، جو شخص یہ خیال کرے کہ یہ تفسیر ہے تو وہ کافر ہے۔ نسفی نے اپنے عقائد میں کہا ہے کہ نصوص کو اپنے ظواہر پر محمول کیا جائیگا۔ اور ان سے اہل باطن کے معانی کی طرف پھرنا الحاد ہے۔

ہم میں یہ رنگ چھٹی صدی میں آ گیا تھا۔ اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ قرآنِ مجید کا تو ذکر ہی کیا ہے! خود ان تفسیروں کی شرحیں اور حاشیے لکھے جانے شروع ہو گئے۔ صرف تفسیر بیضاوی کا ملاعوض نے تیس جلدوں میں حاشیہ لکھا ہے۔

نوٹ: یہاں میرا مقصد حضرات علماء پر اعتراض کرنے کا نہیں ہے بلکہ ایک نہایت اہم مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اقتباسات کو نقل کرتا ہوں۔ حضرات علمائے کرام نے اپنے مذہب کی خدمت جس خلوص اور جانفشانی سے کی ہے، اس کی جزاء صرف اللہ تعالیٰ ہی مرحمت فرما سکتا ہے۔

صحیح انداز پر تعلیمِ قرآن سے محرومی کے نتائج

یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ اصل قرآن پر غور وفکر کرنا اور چیز ہے اور تفاسیر پر غور وفکر کرنا اور چیز ہے۔ اصل قرآن کو چھوڑنے سے اور اس کو صحیح طریقہ سے نہ پڑھنے کی وجہ سے ہم قرآن کی صحیح تعلیم سے محروم ہوتے جاتے ہیں اور اس کے نتائج وہ ہیں جو کہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ خود قرآن سے جو طریقے قرآن کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کے لئے درج ہیں، ان کو چھوڑنے کی وجہ سے بس اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے ہم محروم ہوتے جا رہے ہیں اور قرآن کی تعلیم ہمارے غلط طریقۂ استعمال کی وجہ سے عمدہ نتائج کیوں نہیں پیدا کرتی، یہ حسب ذیل مثالوں سے واضح ہو جائے گا۔ جب سے ہم قرآن کی اصلی تعلیم سے دور ہوتے گئے ہیں، ہم برابر تنزل کر رہے ہیں اور جیسی قوم کی حالت ہوتی ہے، ویسے ہی اس کے اخلاق ہوتے ہیں۔ اگر قوم زندہ ہوتی ہے تو اس کے افراد میں جرأت، ہمت، استقلال، ترقی کی امنگ اور قربانی وغیرہ جیسے عمدہ اخلاق ہوتے ہیں اور اگر قوم میں مردگی ہوتی ہے تو اس کے افراد کم ہمت، سست، بزدل، ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھنے والے ہوتے ہیں۔ قومی تنزل کا مردہ اقوام میں اس قدر اثر ہوتا ہے کہ عمدہ الفاظ کے مفہوم بھی بگڑ کر خراب ہو جاتے ہیں۔

نواب محسن الملک مرحوم نے ایک موقع پر اس بات کو اس مثال سے واضح کیا تھا کہ جب مسلمانوں میں کچھ جان تھی تو ان میں وعدہ اور قول وقرار کا دوسرا مفہوم تھا اور جب ان پر مردنی چھا گئی تو انہی الفاظ کا دوسرا مفہوم ہو گیا۔ پہلے مشہور تھا:

قولِ مرداں جانے دارد ''مردوں کے قول میں جان ہوتی ہے''

پھر یہ حالت ہوئی:

''وعدہ آساں ہے ولے اس کی وفا مشکل ہے''

پھر اس کے بعد یہ حالت ہوگئی:

''وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا!''

اسی طرح جب سے ہم نے قرآنِ مجید کو چھوڑ دیا ہے تو اس وجہ سے ہماری حالت خراب ہوگئی ہے، اور خود قرآنِ مجید کے الفاظ کے مفہوم ہی بدل گئے۔ مثال کے طور پر میں ''توکل'' اور ''صبر'' کے الفاظ پیش کرتا ہوں۔

توکل کیا ہے؟

آج کل ہمارے ہاں ''توکل'' کے معنی ہیں: ہاتھ پیر جوڑ کر بیٹھ جانا اور کچھ کام نہ کرنا۔ اس کو کہتے ہیں ''توکل''۔ اس کے لئے ایسے قصے بھی مشہور ہیں کہ ایک صاحب نے اس طرح ''توکل'' کیا کہ ہاتھ پیر جوڑ کر بیٹھ رہے اور خدا سے کہا کہ میں خود کھانا نہیں کھاؤں گا کہ جب تک خود بخود کھانا میرے منہ میں نہ آ جائے گا۔ اس طرح وہ کچھ عرصہ تک بیٹھے رہے۔ اس کے بعد کھانے کا ایک خوان ان کے سامنے موجود ہو گیا، وہ سمجھے کہ بس کام ہو چکا اور اپنے ہاتھ سے کھانے لگے، اتنے میں آواز آئی کہ تو جلدی کر گیا، اگر کچھ دیر اور منتظر رہتا تو خود بخود تیرے منہ میں کھانا پہنچ جاتا! اور چونکہ قرآن میں ''توکل'' کی تعریف ہے، اس لئے نکموں کی تعریف کی جاتی ہے کہ فلاں صاحب تو کچھ کام نہیں کرتے۔ گھر سے باہر نہیں نکلتے وہ بڑے متوکل ہیں۔ حالانکہ قرآنِ مجید میں تو ''توکل'' کا مفہوم یہ ہے کہ نہایت مشکلات کی حالت میں پوری ہمت سے کام کرنا اور نتیجہ کی طرف سے خائف ہو کر کام نہ چھوڑنا بلکہ نتیجہ کے بارے میں خدا تعالیٰ سے کامیابی کا بھروسہ رکھنا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل آیات سے یہ مفہوم صاف طور سے ظاہر ہوتا ہے۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ۖۗ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬ وَعَلَی اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۳﴾

(سورۃ المائدہ ۲۳)

''وہ لوگ کہنے لگے کہ اے موسیٰؑ! اس ملک میں تو بڑی زبردست قوم رہتی ہے اور جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائے ہم تو اس ملک میں قدم رکھتے نہیں۔ ہاں وہ لوگ اس میں سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہوں گے۔ خدا کا ڈر ماننے والوں میں سے دو آدمی تھے جن پر خدا

تعالیٰ نے اپنی خاص مہربانی کی۔ وہ بول اٹھے کہ ان پر چڑھائی کرکے دروازے میں گھس پڑو اور جب تم دروازے میں گھس پڑے تو بلاشبہ تمہاری فتح ہے اور تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔''

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾ (سورۃ یونس ۷۱)

''اور اے پیغمبر! ان لوگوں کو نوحؑ کا حال پڑھ کر سناؤ، کہ جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ بھائیو! اگر میرا رہنا اور خدا تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنانا تم پر گراں گزرتا ہے تو میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہوں پس تم اور تمہارے شریک سب مل کر اپنی ایک بات ٹھہرالو۔ پھر تمہاری وہ بات تم میں سے کسی پر مخفی نہ رہے۔ پھر جو تم نے کرنا ہے میرے ساتھ کر چکو اور مجھے مہلت نہ دو۔''

حضرت نوح علیہ السلام نے کام نہیں چھوڑا۔ اگر نکمے ہو کر بیٹھ جاتے تو اس چیلنج کی ضرورت نہ تھی۔ قوم صرف یہی چاہتی تھی کہ کام نہ کرو۔

صبر کا مفہوم؟

صبر کے معنی آج کل فقط یہ لئے جاتے ہیں کہ اگر کسی نہ کسی وجہ سے کوئی مصیبت آپڑے تو غم کا اظہار نہ کریں نیز یہ کہ ذلتیں برداشت کرلیں اور چپ بیٹھے رہیں، پلٹتے جائیں اور اف تک نہ کریں۔ ایسے نالائقوں اور بے ہمتوں کی تعریف کی جاتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ قرآن شریف پر عامل ہیں۔ اور قرآن میں صابروں کی تعریف ہے لہٰذا ایسے اصحاب کی بھی تعریف اور وقعت ہونی چاہیئے حالانکہ قرآن مجید میں صبر کا مفہوم ہے کہ صحیح اصول پر کام کرنے میں جو دقتیں پیش آئیں ان کو برداشت کرنا اور کام کو جاری رکھنا اور نبھانا اور دقتوں سے گھبرا کر کام کو نہ چھوڑنا۔ چنانچہ یہ مفہوم مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہو جائے گا۔

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۣ (سورۃ البقرہ ۲۴۹)

''پھر جب طالوت اور ایمان والے، جو ان کے ساتھ تھے نہر کے پار گئے تو جن لوگوں نے طالوتؑ کی نافرمانی کی تھی کہنے لگے کہ ہم میں تو جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کا دم ہی نہیں ہے۔ اس پر وہ لوگ جن کو یقین تھا کہ ان کو خدا کے حضور میں حاضر ہونا ہے بول اٹھے کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اللہ کے حکم سے تھوڑی جماعت بڑی جماعت پر غالب آگئی ہے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور جب جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلہ میں آئے تو دعا کی کہ اے میرے پروردگار! ہم پر صبر انڈیل دے اور معرکۂ جنگ میں ہمارے پاؤں جمائے رکھ اور کافروں کی جماعت پر ہم کو فتح دے اور پھر اللہ کے حکم سے ان لوگوں نے دشمن کو بھگا دیا۔''

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

(سورۃ آل عمران ۱۴۶۔۱۴۷)

''اور بہت سے پیغمبر ہو گذرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لوگ دشمنوں سے لڑے۔ تو جو مصیبت ان کو ان کے راستے میں پہنچی اس کی وجہ سے نہ تو انہوں نے ہمت ہاری اور نہ بودا پن ظاہر کیا اور نہ انہوں نے دشمنوں کے آگے عاجزی کا اظہار کیا۔ اور اللہ تعالیٰ صابروں کو دوست رکھتا ہے اور سوائے اس کے ان کے منہ سے ایک بات بھی تو نہیں نکلی کہ لگے دعائیں مانگنے کہ: پروردگار ہمارے گناہ معاف کر اور ہمارے کاموں میں جو ہم سے زیادتیاں ہوگئی ہیں ان سے درگزر فرما اور دشمنوں کے مقابلہ میں ہمارے پاؤں جمائے رکھ اور کافروں کے گروہ پر ہم کو فتح دے۔''

کلامِ مجید میں صابروں سے توقع کی جاتی ہے کہ کم سے کم اپنی دوگنی قوت پر وہ غالب ہو جائیں گے۔

فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾ (الانفال ۶۶)

''اگر تم میں سے سو صابر ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ایسے ایک ہزار ہوں گے تو وہ خدا کے حکم سے دو ہزار کافروں پر غالب رہیں گے اور اللہ تعالیٰ صابروں کے ساتھ ہے۔''

چند مثالیں

اصل قرآن پیشِ نظر نہ رہنے سے اور اس سے صحیح طریقہ سے مستفید نہ ہونے سے اور اس کی جگہ مختلف لوگوں کی لکھی ہوئی شرحوں کے پیش رکھنے سے ایک تو یہ نقصان ہوا کہ الفاظ کے غلط مفہوم عام طور سے رائج ہو گئے، جیسا کہ ظاہر کیا گیا ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہوا ہے کہ کلام مجید کی تعلیم کے چند ضروری حصے نظر انداز ہو گئے۔ جب اصلی کتاب پیش نظر نہ ہو اور بجائے اس کے مختلف لوگوں کی تصنیف کردہ کتابیں پیشِ نظر ہوں تو لازمی ہے کہ تعلیم اپنے اصلی رنگ میں نہ رہے گی اور اس کا ایک حصہ ضائع ہو جائے گا۔ اس کے متعلق چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ مثلاً دنیوی زندگی کو کامیاب اور قوی بنانے کے وسائل اختیار کرنے کے بارے میں قرآنِ مجید میں جو کچھ تعلیم ہے اس کی طرف سے بالکل غفلت کی جاتی ہے اور اس طرف بالکل توجہ نہیں کی جاتی۔ حالانکہ دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لئے اور اپنی حالت کامیاب اور قوی بنانے کے لئے کامل تیاری کرنا اور تمام امکانی قوتوں سے کام لینا اسلامی فرائض میں داخل ہے اور اس پر قرآنِ مجید میں بہت زور دیا گیا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ

(الانفال ٦٠)

''اور تیاری کرو ان کے واسطے جو کچھ تم کر سکو، قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے (اپنی حالت کو ایسا مضبوط رکھو)''

سورہ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً (توبہ ٤٦)

''اگر یہ لوگ باہر نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لئے تیاری کرتے۔''

سورۃ نساء میں فرمایا:

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ

(النساء ١٠٢)

''کافروں کو تو تمنا ہے کہ تم ذرا بھی اپنے ہتھیاروں اور ساز و سامان سے غافل ہو جاؤ تو یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑیں۔''

بلکہ جو لوگ مسلمانوں کی ترقی میں اور کامیاب اور مضبوط حالت بنانے میں مطلق توجہ

نہیں کرتے اور تمام کام چھوڑ کر سارا وقت نوافل پڑھنے میں صرف کرتے ہیں ایسے حضرات کو بہترین نمونہ اسلام سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآنِ مجید کی یہ تعلیم ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کی حالت محفوظ رکھنے اور قوی بنانے میں موقعہ پر ایک دفعہ بھی تساہل کر جائیں تو خواہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، ان کو مسلمان اپنی جماعت سے خارج کر دیں جب تک وہ اپنے اس تساہل سے باز نہ آ جائیں۔ خود حضرات صحابہؓ میں سے تین اصحاب سے ایک دفعہ ایسے موقع پر تساہل ہو گیا تھا۔ (ان اصحاب کے نام یہ ہیں: کعب بن مالک، بلال بن امیہ، مرارہ بن الربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہم) تو تمام مسلمانوں نے اپنی جماعت سے ان کو علیحدہ کر دیا تھا اور ان سے تمام تعلقات منقطع کر دیئے تھے، یہاں تک کہ گفتگو بھی ترک کر دی تھی۔ جب وہ انتہائی پریشانی اٹھا چکے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے ان سے تعلقات دوبارہ استوار کئے۔ ان کا ذکر سورہ توبہ میں اس طرح ہے۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١١٨﴾ (سورۃ التوبہ ١١٨)

''ان تین افراد پر جو پیچھے رکھے گئے تھے یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہونے لگی اور وہ اپنی جان سے بھی تنگ آ گئے اور سمجھ گئے کہ خدائی گرفت سے اس کے سوا کہیں پناہ نہیں۔ پھر خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی تاکہ قبولِ توبہ کے شکریہ میں آئندہ کے لئے بھی توبہ کئے رہیں بے شک اللہ تعالیٰ بہت ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔''

نیز صحیح حدیث میں بھی صاف طور پر درج ہے کہ مسلمانوں کو محفوظ بنانے کی کوشش کرنا نوافل نماز اور روزہ سے زیادہ بہتر ہے۔

''مسلم بن سلمان فارسی سے روایت ہے، وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی حفاظت کرنا نوافل (نماز، روزہ) سے بہتر ہے اور ایک دن رات سرحد پر پہرہ کا کام کرنا ایک مہینہ کے روزے اور نماز سے بہتر ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ عثمانؓ نے منبر پر خطبہ پڑھنے کے وقت فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ہر ایک رات کی پاسبانی ہزار رات سے بہتر ہے کہ جن میں رات کو نوافل پڑھے۔''

تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۳۷۳ میں درج ہے کہ ۱۷۰ھ میں عبداللہ بن مبارک نے، جو

مسلمانوں کو محفوظ اور قوی بنانے کی کوشش میں مصروف تھے، حسب ذیل شعر فضیل بن عیاض کو لکھ کر روانہ کیا تھا۔ فضیل ابن عیاضؒ صوفیاء کے امام ہیں۔ وہ اس وقت مسجد حرام میں عبادت اور روحانی ریاضتوں میں مصروف تھے۔

ترجمہ: ''اے حرمین کے عابد! اگر تو ہماری حالت دیکھے تو جان لے کہ تو عبادت میں کھیل رہا ہے یعنی تیری عبادت مثل لہو ولعب کے ہے۔''

جس وقت حضرت فضیلؒ بن عیاض نے یہ شعر پڑھا تو رو پڑے اور فرمایا کہ عبداللہ بن مبارک نے صحیح لکھا ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ معاش حاصل کرنا اور اس کے لئے کوشش کرنا اور اس کے وسائل حاصل کرنا دنیاداری کو بزعم خود دین سے علیحدہ تصور کیا جاتا ہے، حالانکہ خود قرآن کی تعلیم ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

(سورہ جمعہ ۱۰۱)

''پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور خدا کے فضل (یعنی معاش) کی جستجو میں لگ جاؤ۔''

چنانچہ اکثر صحابہ اور ائمۂ سلف کسب معاش کیلئے تجارت وغیرہ جیسے وسائل میں مصروف رہتے تھے۔ بخلاف اس کے آج کل ہمارے مقتدیٰ، ان وسائل میں مصروف ہونا خلافِ تقدس اور کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ یہ بات قرآن کی تعلیم سے بعد کا نتیجہ ہے۔

تیسری مثال: عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمان دنیا میں ذلت اور مسکینی کی زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں حالانکہ قرآنِ مجید کی تعلیم کے یہ بالکل خلاف ہے اور قرآنِ مجید میں ذلت اور مسکنت کو خدا کے غضب اور عذاب کی نشانی بتایا گیا ہے جو حسب ذیل آیات سے ظاہر ہے۔ سورہ زمر میں ہے:

كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ (۳۹:۲۵-۲۶)

''جو لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں، انہوں نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا تو ان کو عذاب نے ایسی طرف سے آلیا کہ انہیں اس کی خبر بھی نہ تھی۔ تو ان کو اس دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے ذلت کا مزہ چکھا دیا۔''

سورۃ بقرہ میں یہود کی خرابیوں کے ذکر کے بعد ان کو عذاب سے اس طرح ڈرایا گیا ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ

''تو تم کتابِ الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے۔ تو جو لوگ تم میں سے ایسا کریں گے اس کے سوا ان کا اور کیا بدلہ ہو سکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ان کی ذلت ہو اور آخر کار قیامت کے دن بڑے ہی سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں (یعنی دنیا کی ذلت بدعملیوں کی سزا ہے)۔

دوسرے موقع پر سورہ آل عمران میں اہل کتاب کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ

(آل عمران ۱۱۱)

''جہاں دیکھو ذلت ان کے سر پر سوار ہے اور خدا کے غضب میں گرفتار ہیں اور محتاجی ہے کہ الگ ان کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ (یعنی مسکینی خدا کے غضب کی نشانی ہے)۔

بخلاف اس کے جن لوگوں پر خدا تعالیٰ اپنا فضل وکرم فرماتا ہے ان کو برتری اور سلطنت عطا فرماتا ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران ۱۳۹)

''نہ ہمت ہارو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب ہو گے اگر تم مومن ہو۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝

(انبیاء ۱۰۵)

''اور ہم زبور میں پند ونصیحت کے بعد یہ بات لکھ چکے ہیں کہ ہمارے نیک بندے زمین کی سلطنت کے وارث ہوں گے۔''

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

(النور ۷۵)

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے ہیں ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کی خدمت (یعنی سلطنت) ضرور عطا فرمائے گا۔''

چوتھی مثال: عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ جنت کے کامل استحقاق کے لئے نماز پڑھنا، روزے رکھنا، حج کرنا، تسبیح اور ورد ووظائف کرنا اور ڈاڑھی رکھنا کافی ہے۔ اگر پورا مذہبی اور

جنتی مسلمان بننے کے لئے صرف یہی شرائط سمجھی جائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اشاعت و حفاظت اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و ترقی کے لئے اپنے آپ کو مشقت اور محنت میں مبتلا کریں اور آرام و راحت کی زندگی بسر نہ کریں! جب ابتدائے عمر سے یہ ذہن نشین ہو چکا ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے بغیر بھی کوئی شخص کامل مسلمان ہو سکتا ہے تو پھر قومی حیات کے لئے ایثار کرنے پر کیا چیز ہم کو آمادہ کر سکتی ہے؟ حالانکہ قرآنِ مجید میں صاف طور پر درج ہے کہ ہماری نجات کے لئے اس زندگی میں پوری اور ہر طرح کی کوشش کی ضرورت ہے۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿۲۱۴﴾

(البقرہ ۲۱۴)

”کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تک تم کو ان لوگوں کی سی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں کہ ان کو سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ جھر جھراتے بھی گئے یہاں تک کہ پیغمبر اور ایمان جو ان کے ساتھ تھے کہنے لگے کہ خدا کی مدد کب آئے گی؟ خبردار! اللہ تعالیٰ کی مدد قریب ہے۔“

سورہ آلِ عمران میں فرمایا ہے:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ﴿۱۴۲﴾

(آل عمران ۱۴۲)

”کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم سے وہ لوگ معلوم نہیں کئے جو مجاہد ہیں اور نہ وہ معلوم کئے جو ثابت قدم رہتے ہیں۔“

سورہ توبہ میں فرمایا ہے:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً ۚ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۶﴾ (التوبہ ۱۶)

”کیا تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے کہ چھوٹ جاؤ گے اور ابھی اللہ نے وہ لوگ نہیں معلوم کئے جو تم میں سے مجاہد ہیں اور سوائے اللہ کے اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے کسی کو اپنا ولی و دوست نہیں بناتے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔“

سورہ محمد میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوَ أَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾

(سورہ محمد ۳۱)

”اور تم کو ہم ضرور آزمائیں گے، تاکہ تم میں جو مجاہد ہیں اور اس کے باوجود ثابت قدم رہنے والے ہیں، ان کو ہم معلوم کر لیں اور تاکہ تمہارے حالات کو معلوم کر لیں۔“

سورۂ عصر میں ”حق“ اور ”صبر“ کی وصیت کو سب پر لازمی قرار دیا گیا ہے اور ظاہر کیا گیا ہے کہ بغیر اس کے سب لوگ نقصان میں ہیں۔

وَالْعَصْرِ ﴿۱﴾ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ﴿۲﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾ (سورۂ العصر)

”زمانہ کی قسم انسان خسارے میں ہے۔ مگر وہ لوگ! جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے رہے اور صبر کی وصیت کرتے رہے۔“

امام رازی اپنی تفسیر کبیر میں اس سورۃ کی تشریح فرماتے ہوئے صاف طور پر فرماتے ہیں:

”اس میں وعید سخت ہے۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے خسارہ کا حکم لگایا ہے تمام لوگوں پر سوائے اس کے جو ان چار چیزوں پر کاربند ہوا اور وہ ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کرنے والے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نجات ان چاروں کے مجموعہ پر منحصر ہے اور یہ کہ جس طرح ہر ایک مکلّف شخص کو ان چیزوں کا حاصل کرنا ضروری ہے، جو اس کے نفس کیلئے خاص ہیں، اسی طرح وہ امور بھی ضروری ہیں جو غیروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ منجملہ ان کے مذہب کی طرف دعوت دینا اور خیر خواہی کرنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اور تواصی کو مکرر لائے ہیں تاکہ پہلا لفظ دعوت الی اللہ پر دلالت کرے اور دوسرا لفظ اس پر ثابت قدم رہنے پر۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ حق ایک بھاری چیز ہے اور بہت سی تکلیفیں اس کیلئے لازمی ہیں۔ اس لئے تواصی بالصبر کا حکم دیا گیا ہے۔“

میں پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ اصل قرآن چھوڑنے سے اور اس کے صحیح طریقہ سے مستفید نہ ہونے سے ایک تو قرآن کے الفاظ کے غلط مفہوم رائج ہو گئے ہیں اور دوسرا اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ اس کی تعلیم کا ایک حصہ ہم نے بھلا دیا ہے۔ حالانکہ کلام مجید میں بہت زور اس پر دیا گیا ہے کہ تعلیم کے کسی حصے کو نظر انداز نہ کرو بلکہ سب کو پیشِ نظر رکھو ورنہ ذلت اور

عذاب نازل ہوگا۔ بنی اسرائیل سے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ

''تو کیا کتاب الٰہی کی بعض آیتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے۔ تو جو لوگ تم میں سے ایسا کریں تو سوائے اس کے ان کا اور کیا بدلہ ہوسکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ان کی رسوائی ہے اور آخر کار قیامت کے دن بڑے ہی سخت عذاب کی طرف لوٹا دیئے جائیں۔''

صحیح طریقۂ تعلیم کو چھوڑنے سے تیسرا بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ کلامِ مجید کی تعلیم پر پورا غور وفکر نہ کرنے سے کلامِ مجید کے بعض حصوں کو محض چند مکاتبوں اور تفریحی باتوں کا درجہ دیتے ہیں۔ اور ان سے مستفید ہونے کا قصد ہی نہیں کرتے اور اس طریقہ سے ہم کلام مجید کی تعلیم کے ایک حصے سے صحیح معنوں میں مستفید ہونے سے محروم ہوگئے ہیں۔ قرآن مجید میں جو قصص موجود ہیں ان کو ہم صرف یہ درجہ دیتے ہیں۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (الانفعال ۳۱)

''یہ اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ (اہم ان قصوں کو اسی درجہ پر رکھتے ہیں)''

حالانکہ قرآن مجید میں اس حصہ تعلیم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِىْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (سورۂ ہود ۱۲۰)

''اے پیغمبر! دوسرے پیغمبروں کے جتنے قصے ہم تم سے بیان کرتے ہیں ان کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کی ڈھارس بندھاتے ہیں۔ اور ان قصوں کے ضمن میں ایک تو جو حق بات تھی وہ تمہارے پاس پہنچی۔ اس کے علاوہ اس مسلمان کے لئے نصیحت اور یاددہانی ہے۔''

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (الاعراف ۱۷۶)

''ان سے قصے بیان کرو تاکہ یہ لوگ غور کریں''

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (سورۃ النساء ۲۶)

''اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ (انبیاء وصلحاء) جو تم سے پہلے ہوگذرے ہیں ان کے طریقے تم سے کھول کھول کر بیان کرے اور تم کو انہیں کے طریقے پر چلائے۔''

تیسرا باب

قصص القرآن

قرآن کریم میں ان قصوں کے درج ہونے کا مقصد یہ ہے کہ ہم ان واقعات سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے لئے ان کو شمعِ ہدایت بنائیں اور جو انبیاء اور صلحاء پہلے گذرے ہیں، ان کے نقش قدم پر چل کر پوری کامیابی حاصل کریں۔ افسوس! ہم ان کو صرف کہانیاں سمجھتے ہیں اور کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ان قصص میں ہمارے لئے ایسی تعلیم موجود ہے کہ اگر ہم ان سے فائدہ اٹھانا چاہیں، انہیں اپنے پیشِ نظر رکھیں اور ان پر عمل کریں تو دنیا کی بہترین قوم بن سکتے ہیں۔ چنانچہ قرونِ اولیٰ میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند قصص کی تعلیم کا کچھ کچھ حصہ پیش خدمت ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام:

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو ہم صرف ایک حسن ومحبت کا واقعہ سمجھتے ہیں حالانکہ اس کو قرآن مجید میں احسن القصص کہا گیا ہے۔ جس طرح ایک صاحب سے ان کو پورا شاہنامہ سنا چکنے کے بعد شاہنامہ کے کسی عمدہ شعر پڑھنے کی خواہش کی گئی تو انہوں نے یہ شعر پڑھا تھا:

میزہ منم دخت افراسیاب
برہنہ تنم را نہ دید آفتاب۔

یہی ہماری حالت ہے!

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں علاوہ اس کے کہ اس میں رسول کریم صلعم کو آپ کے آئندہ واقعات کی خبر دی گئی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے مثل ہونے والے

تھے کہ آپ کو آپ کے بھائی وطن سے علیحدہ کریں گے اور وطن سے باہر جانے کے بعد دوسری جگہ آپ کو کامیابی ہوگی اور اس کے بعد آپ کے بھائی قریش آپ سے معافی چاہیں گے اور آپ ان کی معافی عطا کریں گے وغیرہ وغیرہ۔

علاوہ اس کے اس قصہ میں ان اخلاق کی تعلیم ہے جس سے ایک شخص غلام کی حیثیت سے ترقی کر کے حکومت کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام بحیثیت ایک غلام کے مصر میں داخل ہوئے اور آپ کو عزیز مصر نے خرید لیا۔ یہ آپ کی پہلی حالت ہے۔ اس درجہ سے حکومت تک پہنچنے کے لئے خاص طور پر ان اخلاق کی ضرورت ہے۔

(۱) جذبات پر قدرت۔ (۲) امانت (۳) صحیح اصول کی پابندی میں دقتیں برداشت کرنا خواہ کیسی ہی حالات ہوں۔ (۴) اپنا کام جاری رکھنا۔ (۵) پریشانیوں سے گھبرا کر اپنا کام نہ چھوڑنا۔ ان اخلاق کی تعلیم حضرت یوسفؑ کے واقعات سے اچھی طرح مل سکتی ہے۔ زلیخا کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا اس میں اپنے جذبات پر قدرت رکھنے اور آقا کی امانت میں خیانت نہ کرنے کی نہایت اچھی نظیر ہے جس وقت زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ دھمکی دی:

وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ (۱۲:۳۲)

''اور جس کام کرنے کو میں کہہ رہی ہوں اگر اس کو نہیں کرے گا تو ضرور قید کیا جائے گا اور ضرور بے عزت بھی ہوگا۔''

تو آپ نے فرمایا:

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ (۱۲:۳۳)

''کہا اے میرے پروردگار! جس حرکت کی طرف یہ مجھے بلا رہی ہے، قید ہی میں رہنا مجھ کو اس سے کہیں زیادہ پسند ہے۔''

اپنے صحیح اصول کے خلاف عمل کرنے کے بجائے قید کی مشقتیں برداشت کرنا مجھ کو پسند ہے۔ جس وقت آپ قید خانہ میں محصور کئے گئے تو آپ نے وہیں قیدیوں میں تبلیغ شروع کردی۔ جیل خانہ میں آپ نے اس طرح تبلیغ شروع کردی:

مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ

(سورہ یوسف: ۳۹:۴۰)

''ہم کو شایاں نہیں کہ خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک بنائیں۔ اے یارانِ مجلس بھلا دیکھو تو سہی کہ جدا جدا معبود اچھے یا خدائے یگانہ وزبردست۔ تمام جہان میں حکومت تو بس ایک اللہ کی ہے اور اس نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی پرستش کرو، یہی دین کا سیدھا راستہ ہے۔''

اپنے مقصد کو نہ چھوڑنے اور ہر حال میں کام جاری رکھنے کے لئے خواہ آزادی ہو یا نہ ہو، یہ نہایت عمدہ سبق ہے۔ غرض حضرت یوسف علیہ السلام ایک اجنبی ملک میں غلامی کے درجے سے ترقی کر کے اس درجہ تک پہچے کہ آپ نے فرمایا:

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ (سورہ یوسف: ۱:۱۱)

''اے میرے پروردگار! تو نے مجھے حکومت سے حصہ دیا۔

قصہ طالوت و جالوت:

طالوت اور جالوت کے قصے کو محض ایک واقعہ کی حیثیت دی جاتی ہے حالانکہ اس میں کام کرنے والوں کیلئے نہایت اعلیٰ درجہ کی ہدایتیں موجود ہیں۔

کام کرنے کے لئے افسر کی ضرورت: افسر کے صفات کہ علمی اور جسمانی دونوں قوتیں اس میں اعلیٰ درجہ کی موجود ہونا ضروری ہیں۔ اور اس بات کی تردید کہ مالدار ہونا افسری کے لئے شرط ہے۔ افسر کی صفات کے علاوہ اس کے ساتھ کام کرنے والوں کی صفات کا بھی ذکر ہے کہ لوگ آزمائش کے بعد منتخب شدہ ہوں۔ اس کے بعد ظاہر کیا گیا ہے کہ کامیابی کے لئے زیادتی تعداد لازمی نہیں کیونکہ اگر تعداد کم ہو لیکن لوگ ثابت قدم ہوں اور مشکلات برداشت کرنے والے ہوں اور جذبات پر قدرت رکھتے ہوں تو کثیر جماعت پر غالب ہوں گے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاۗىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ

التَّابُوۡتُ فِيۡهِ سَكِيۡنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوۡسٰى وَاٰلُ هٰرُوۡنَ تَحۡمِلُهُ الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ ؕ
اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوۡتُ بِالۡجُـنُوۡدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ
مُبۡتَلِيۡكُمۡ بِنَهَرٍ‌ ۚ فَمَنۡ شَرِبَ مِنۡهُ فَلَيۡسَ مِنِّىۡ ۚ وَمَنۡ لَّمۡ يَطۡعَمۡهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡٓ اِلَّا مَنِ
اغۡتَرَفَ غُرۡفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوۡا مِنۡهُ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡهُمۡ‌ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ ۙ
قَالُوۡا لَا طَاقَةَ لَنَا الۡيَوۡمَ بِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ‌ ؕ قَالَ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمۡ مِّنۡ
فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةً ۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوۡا لِجَالُوۡتَ
وَجُنُوۡدِهٖ قَالُوۡا رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۵۰﴾
فَهَزَمُوۡهُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۙ قف

''اے پیغمبر! کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں پر نظر نہیں کی کہ ایک زمانہ میں انہوں نے موسیٰؑ کے بعد اپنے وقت کے پیغمبر سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کیجئے کہ ہم اس کے سہارے اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔۔۔۔اور ان کے پیغمبر نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری درخواست کے مطابق طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔ اس پر کہنے لگے کہ اس کو ہم پر کیونکر حکومت مل سکتی ہے، حالانکہ اس سے تو حکومت کے ہم زیادہ حقدار ہیں کہ اس کو مال و دولت کے لحاظ سے بھی کچھ ایسی فارغ البالی نصیب نہیں ہے۔ پیغمبر نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر حکومت کیلئے اس کو پسند فرمایا ہے۔علم اور جسم میں اس کو بڑی فراخی دی ہے۔ پھر جب طالوت فوجوں سمیت اپنے ٹھکانے سے روانہ ہوا تو اس نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ راستہ میں ایک نہر پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ اس نہر سے تمہارے صبر کی آزمائش کرنے والا ہے۔ جو اس کا پانی پی لے گا وہ ہمارا نہیں۔ پس ان لوگوں میں سے معدودے چند کے سوا سبھی نے تو اس سے پی لیا۔ پھر جب طالوت اور ایمان والے جو اس کے ساتھ تھے نہر سے پار گئے اور جن لوگوں نے طالوت کی نافرمانی کی تھی کہنے لگے کہ ہم میں تو جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کا دم نہیں ہے۔اس پر وہ لوگ جن کو یقین تھا کہ ان کو خدا کے حضور میں حاضر ہونا ہے، بول اٹھے کہ اکثر ایسا ہی ہوا ہے کہ اللہ کے حکم سے تھوڑی جماعت بڑی جماعت پر غالب آگئی ہے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور (وہ) جب جالوت اور اس کے فوجوں کے مقابلہ میں آئے تو دعا کی: اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر انڈیل دے اور جنگ میں ہمارے پاؤں جمائے رکھ اور کافروں پر ہم کو فتح دے۔ پھر ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے

دشمنوں کو بھگا دیا۔

میدانِ جنگ میں کامیابی کیلئے اس قصے میں خصوصیت سے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اگر افسر اعلیٰ درجہ کا ہو اور اس کے ساتھ خدا سے تعلق رکھنے والے ثابت قدم، جذبات پر قدرت رکھنے والے اشخاص ہوں تو پھر خواہ تعداد کم ہی کیوں نہ ہو، یہ کامیاب ہوں گے۔ عین حالتِ جنگ میں خدا سے دعا کرنے کا بھی ذکر ہے۔ جن حضرات پر مادیت کا رنگ غالب ہوگا، وہ خیال کرتے ہوں گے کہ میدانِ جنگ کا روحانیت سے کیا تعلق! اس وقت تو صرف سامانِ حرب کی ضرورت ہے۔ ان کو یورپ کے ایک سپہ سالار کا قول آتا ہوگا کہ

''خدا بھاری توپوں کی طرف ہوتا ہے''

لیکن ان حضرات کو معلوم ہونا چاہیئے کہ خود یورپ جو مادیت کا مرکز ہے ایسی مادیت کو خیر باد کہہ رہا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ جرمن کے مشہور جرنیل: وان برن ہارڈی، نے اپنی کثیرا الاشاعت کتاب ''جرمنی دی نیکسٹ وار'' میں جو سنہ ۱۹۱۱ع میں شائع ہوئی ہے ص ۱۳۳ پر میدان جنگ میں کامیاب ہونے کے لئے وہی شرائط درج کی ہیں جو آج سے تیرہ سو سال پہلے قرآن مجید اس قصے کے ذریعہ سے بتلا چکا ہے۔ جرمنی نے فن حرب میں جو کچھ ترقی کی ہے اس کو مدنظر رکھ کر جب یہ خیال کیا جائے کہ اس کے قابل ترین جرنیل کامیابی کے لئے آج بھی وہی اصول بہترین سمجھتے ہیں جو صدیوں پیشتر قرآنِ مجید کے ذریعہ سے شائع ہوئے ہیں تو کچھ اندازہ قرآن کی تعلیم کے متعلق ہوسکتا ہے۔ جرنیل وان برن ہارڈی لکھتے ہیں:

''لیکن ایک حد تک جو کہ قانونِ اعداد سے وابستہ ہے، اس زمانے کی بیشمار افواج کے نظام میں فوقیت کے حقیقی عناصر روحانی اور اخلاقی قوتیں ہیں اور بہت بڑی تعداد والی فوج ایک قلیل تعداد والی عمدہ اور صابر افسر رکھنے والی اور جانباز فوج سے شکست کھا جائے گی۔''

اس موقعہ پر میں یہ ظاہر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ یورپ کی مادیت نے ہمارے بعض حضرات پر ایسا اثر کیا ہے کہ اس سے مرعوب ہوکر وہ حضرات بعض اسلامی باتوں میں تاویلیں کرنے لگے۔ مثلاً حصولِ مقصد کیلئے دعا کو بھی منجملہ ذرائع کے ایک ذریعہ سمجھنے سے انکار کردیا گیا ہے۔ فرشتوں کے متعلق کہا گیا کہ بذاتِ خود ان کی کوئی ہستی نہیں ہے بلکہ مختلف قوتوں کو فرشتوں کے نام سے موسوم کردیا گیا ہے۔ بعض حالات میں جو اجازت تعدد ازدواج کی ہے۔ اسی کی بھی ممانعت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ اطمینان بخش بات ہے کہ آہستہ آہستہ خود یورپ اور امریکہ کے فاضل اسلامی خیالات کے پیرو ہوتے جاتے ہیں۔

جنگِ عظیم کے دوران میں جس وقت بحرِ شمالی میں انگلستان کے جنگی جہاز جرمن جہازوں سے سرگرمِ پیکار ہوئے تو بذریعۂ تار، گرجا گھروں کو اطلاع دی گئی کہ لوگوں کو جمع کر کے فوراً خدا سے کامیابی کے لئے دعا شروع کردی جائے۔ اسی سال قیصرِ جرمنی کی سالگرہ کے موقعہ پر جشن پہلے جیسے نہیں کئے گئے بلکہ ہدایت کی گئی تھی کہ تمام دن محض دعا کی جائے۔

فرشتے:

ان واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ خود یورپ میں بھی دعا کو آج کل کس قدر اہمیت دی جاتی ہے۔ سر آلیور لاج۔ ڈی۔ ایس۔ سی۔ ایل۔ ڈی۔ ایف۔ آر۔ ایس، پرنسپل برمنگھم یونیورسٹی، پریزیڈنٹ ایسوسی ایشن ان سائنس اپنے مضمون ''موت کے بعد زندگی ہے؟'' میں، جو دسمبر ۱۹۱۴ء کے ''ریویو ان ریویوز'' میں شائع ہوا ہے فرشتوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''ہم اس سیارہ (زمین) میں بعض حیثیتوں سے محدود حالت میں ہیں اور گردو پیش جو کچھ ہو رہا ہے اس میں سے بہت سے حصے ہمیں نظر نہیں آتے۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ ہم ایسی ہستیوں سے گھرے ہوئے ہیں جو کہ ہمارے ساتھ کام کرتی رہتی ہیں۔ میرا یقین ہے کہ جیسا کہ مذاہب ہمیں بتلاتے ہیں: فرشتے ہمارے ساتھ ہیں، یہ بالکل صحیح ہے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ انسان تنہا نہیں ہے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ میں جانتا ہوں کہ وہ روحانی ہستیوں سے گھرا ہوا ہے، اور میں تم سے کہتا ہوں کہ اعلیٰ روحانی ہستیاں موجود ہیں جن کے مقابلہ میں ہم چیونٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے حواسِ خمسہ ہم کو بعض معلومات بہم پہنچاتے ہیں لیکن یہ بہت محدود معلومات ہوتی ہیں۔ اگر صرف ہمارے حواس ہی موجود ہوتے تو ہم عالم کی تحقیقات اچھی طرح نہ کر سکتے لیکن ان حواس کو ہم ترقی دیتے ہیں اور ہر قسم کے آلات کے ذریعے سے ان میں اضافہ کرتے ہیں۔ خوردبین اور دوربین وغیرہ ہمارے حواس کی قوتوں میں اضافہ کرنے والی ہیں اور اس طریقہ سے ہم زیادہ علم حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ان حواس کو کتنی ہی مدد دی جائے یہ ہمیں بہت ہی کم اطلاعیں بہم پہنچاتے ہیں۔ کثرت سے ایسی چیزیں موجود ہیں جن سے ہم ابھی تک محض ناواقف ہیں۔ بایں ہمہ ان میں سے بعض سے ہمارا تعلق ہے۔ لیکن یہ تعلق ہمارے حواس کے ذریعہ سے نہیں ہوا کیونکہ ہم صرف جسم نہیں ہیں۔

ہم نفس ناطقہ، وجدان اور روح بھی ہیں اور بعض اعلیٰ ہستیوں سے انسان کا تعلق ایسے ذرائع سے ہے جو کہ جسمانی اعضاء سے وابستہ نہیں ہیں۔''

تعددِ ازدواج امریکن مقنن کی نظر میں

تعدد ازدواج کے متعلق امریکہ کے مقنن اور جرنلسٹ مسٹر ہنری واکر تازہ رسالہ دی فارم میں فرماتے ہیں:

''تحریکِ نسوانی کا حقیقی مطمحِ نظر ایسا تعدد ازدواج (ایک سے زیادہ بیویاں ہونا) ہے جو قانون ہو اور سلطنت کے ذریعہ سے اس کا انتظام ہو اور مبنی بر اخلاقِ حسنہ ہو۔ وحدتِ ازدواجی (ایک بیوی ہونا) کے سخت اصول کا تجربہ کبھی کامیاب نہیں ہوا اور دنیا کی تاریخ کے کسی حصہ میں اس کا وجود بحیثیت واقعہ حقیقی نہیں رہا اور نہ آج اس کا کہیں وجود ہے۔''

بازاری عورت کا المناک مگر روزمرہ کا مشاہدہ ہی تنہا اس کا کافی ثبوت ہے۔ اگرچہ اب تک ازراہِ مروت اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ اس کا وجود فقط اسی حالت میں غائب ہوسکتا ہے، جب کہ انسانی فطرت بالکل بدل جائے اور یا پھر مرد و عورت کے باہمی تعلقات ایسے طریقوں سے بدل جائیں جو وحدتِ ازدواجی کی نسبت ممکن تر اور عقل کے زیادہ مطابق ہوں۔ یہ پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ تعدد ازدواج کا قانونی طریقہ سے دوبارہ اجراء، طلاق کے کم کرنے میں بہت زیادہ مؤثر ہوگا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے بعض غیر معمولی مناقشے اور نزاعات جو موجودہ وحدتِ ازدواج کے اصول اور اس کے ناقص حالات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں وہ جاتے رہیں گے۔

اس موقعے پر ان چند مسائل کے ذکر کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کا وہ نہایت قلیل حصہ بھی، جس کے متعلق یہ سمجھا گیا تھا کہ یورپ کی مادیت کی تہذیب سے رنگے ہوئے مسلمان اسے قبول نہ کرسکیں گے (اور غالباً اس لئے اس میں تاویلیں شروع کردی گئی تھیں) اس قدر فطرت کے مطابق ہے کہ تجربہ کے بعد آخرکار اس کے سخت ترین مخالف بھی اس کے پیرو ہونے پر مجبور ہوتے جاتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے فاضلوں کے یہ اقتباسات میں ان باتوں کی صحت کے لئے بطور استدلال پیش نہیں کر رہا ہوں کیونکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

قصۂ حضرت ابراھیم علیہ السلام:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں یہ تعلیم ہے کہ چاہے اپنے نہایت عزیز رشتہ دار اور ساری دنیا اپنے خلاف ہو جائے مگر خدا کے احکام کی پیروی ہرگز نہ چھوڑے اور اپنے صحیح مقصد کی تکمیل میں مصروف رہے خواہ کتنی ہی مشکلات برداشت کرنا کیوں نہ پڑیں اور کتنی ہی قربانیوں کی ضرورت کیوں نہ ہو۔ نیز خدا کے احکام کی تعمیل کا نمونہ جناب نے پیش کیا ہے کہ اپنے بیٹے تک کی قربانی کے لئے تیار ہو گئے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ

''مسلمانو! ابراہیم ؑ اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے (بغیر مسلمان اس وقت کے) پیروی کرنے کیلئے تمہارے لئے ان کا ایک اچھا نمونہ ہو گزرا ہے۔ جب کہ انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم کو تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو، کچھ بھی سروکار نہیں ہے۔ ہم تم لوگوں کے عقیدے کو بالکل نہیں مانتے اور ہم میں اور تم میں کھلم کھلا عداوت اور دشمنی قائم ہو گئی ہے اور یہ دشمنی تو ہمیشہ کیلئے رہے گی۔ جب تک کہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ''

حضرت ابراہیم ؑ نے اپنی بات کو پوری طرح سمجھایا لیکن جب وہ مقصد کے مخالف رہے تو آپ نے اس سے بھی قطع تعلق کیا۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۡ ۖ

''جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا اے باپ! آپ کیوں بتوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ کچھ سنتے ہیں اور نہ کچھ دیکھ سکتے ہیں اور نہ آپ کے کچھ کام آ سکتے ہیں؟ اور ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے کہا کہ کیا تو میرے معبودوں سے پھرا ہوا ہے اگر تو ایسی باتوں سے باز نہیں آئے گا تو ضرور میں تجھے سنگسار کردوں گا اور اپنی خیر چاہتا ہے تو میرے سامنے سے دور ہو۔ ابراہیم ؑ نے کہا تیری سلامتی رہے، میں تیرے گناہ بخشواؤں گا اپنے رب سے، بیشک وہ مجھ پر مہربان ہے اور میں نے تم بت پرستوں کو اور تمہارے ان بتوں کو، جن کو تم خدا کے سوا

پکارتے ہو، سب کو چھوڑا اور اپنے پروردگار ہی کو پکارتا ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آپ کی قوم نے کہا:

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ (۲۹ : ۲۴)

''ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا اس کے سوا کوئی جواب ہی نہ تھا کہ کہنے لگے کہ اس کو مار ڈالو یا جلا دو۔''

لیکن آپ برابر ثابت قدم رہے اور اپنا کام کرتے رہے۔ اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامیاب کیا اور سب مصیبتوں سے نجات دی۔

قصہ حضرت نوح علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات کو ہم صرف طوفانِ نوح کے واقعات تک محدود کرتے ہیں اور فقط اس پر بحث ہوتی ہے کہ پانی کس قدر برسا تھا اور کہاں کہاں طوفان کا اثر پہنچا تھا اور کہاں کہاں پہنچ سکتا ہے؟

حالانکہ ان واقعات سے استقلال سے مسلسل عرصہ دراز تک کام کرنے کی اور اپنے مقصد کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں کرنے کی تعلیم حاصل ہوتی ہے نیز یہ کہ رشتہ دار اگر اچھے عمل نہ کرتے ہوں اور مقصد کے خلاف ہوں تو ان سے تعلق نہ رکھا جائے وہ رشتہ دار ہی نہیں۔ حضرت نوح ؑ خدا تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں:

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ۙ﴿۵﴾ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاۗءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ﴿۶﴾ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ﴿۷﴾ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۙ﴿۸﴾ ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۙ﴿۹﴾

''خدا سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو رات کے وقت بھی بلایا اور دن کے وقت بھی بلایا۔ تو میرے بلانے کا ان پر یہی اثر ہوا کہ جتنا زیادہ بلایا اتنا ہی زیادہ بھاگے۔ اور جب میں نے ان کو بلایا کہ میری طرف رجوع ہوں۔ اور تو ان کے گناہ معاف فرمائے تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اوپر سے اپنے کپڑے اوڑھ لئے اور ضد کی اور شوخی میں اکڑ اکڑا بیٹھے۔ پھر میں نے ان کو پکار کر بلایا اور ان کو ظاہر بھی سمجھایا اور پوشیدہ بھی سمجھایا۔''

عرصہ دراز تک آپ نے مسلسل رات دن کام کیا اور ہر ممکن صورت سے کیا۔ یہ نہیں کہ تھوڑے زمانے تک کام کر کے بیٹھ رہے۔ جس وقت کہ حضرت نوح ؑ کا بیٹا غرق ہو رہا تھا تو

آپ نے دعا کی:

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِىْ مِنْ اَهْلِىْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ۝ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّىْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّىْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِىْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِىْ وَتَرْحَمْنِىْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

"نوحؑ نے اپنے پروردگار کو پکارا اور عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میرا بیٹا بھی میرے اہل وعیال میں داخل ہے اور جو تو نے وعدہ فرمایا تھا وہ سچا ہے اور تو سب سے بڑا حاکم ہے۔ خدا نے فرمایا کہ اے نوحؑ! تمہارا بیٹا تمہارے اہل وعیال میں داخل نہیں کیوں کہ اس کے عمل اچھے نہیں، تو جس چیز کی حقیقت کا تمہیں حال معلوم نہیں، ہم سے اس کی درخواست نہ کرو۔ ہم تم کو سمجھائے دیتے ہیں کہ نادانوں کی سی باتیں نہ کرو۔ نوح علیہ السلام نے عرض کی کہ اے میرے پروردگار! میں اس سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے ایسی چیز کی درخواست کروں کہ جس کی حقیقت حال مجھے معلوم نہیں ہے۔ آپ کا بیٹا اور بیوی دونوں غرق ہوئے لیکن آپ نے یہ قربانی برداشت کی۔ لوگوں نے آپ سے کہا:

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۝ (۲۶/۱۱۵)

"وہ بولے نوحؑ! اگر تم اپنی حرکت سے باز نہ آؤ گے تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔"

اور یہ کہا:

مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ

(۲۳/۲۴، ۲۵)

"یہ بھی تم جیسا آدمی ہے اور تم سے برتر ہونا چاہتا ہے، بس یہ ایک آدمی ہے جس کو جنون ہو گیا ہے۔"

لیکن آپ نے کسی دھمکی اور نہ کسی طعنے کی پرواہ کی اور برابر کام میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ آپ کے مخالف تباہ ہو گئے۔

قصۂ حضرت موسیٰ علیہ السلام:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کو ہم چند معجزات میں محصور کرتے ہیں اور اس پر بحث کرتے ہیں کہ آیا جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحیرۂ قلزم عبور کیا تو معجزہ کی وجہ

سے پانی پھٹ کر علیحدہ علیحدہ ہو گیا اور خشکی نکل آئی یا معجزہ کچھ نہ تھا صرف مدوجزر تھا۔ اپنی ساری توجہ صرف انہی باتوں میں صرف کرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں تعلیم ہے: اپنی قوم کو انتہائی ذلت اور ظلم سے نکال کر ترقی کے اعلیٰ درجہ تک پہنچانے کی۔ بنی اسرائیل ایسی ذلیل حالت میں تھے کہ ان کے حاکم ان کے بیٹے ذبح کرتے تھے اور ان کی بیٹیاں اپنی خدمت کیلئے زندہ رکھتے تھے۔ نیز اس میں تعلیم ہے ان اوصاف کی جن کے ذریعہ سے ایسی ترقی ممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرماتا ہے کہ تم اور تمہارے بھائی (تم دونوں) فرعون کے پاس جاؤ:

اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ

"تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔ اس نے بہت سر اٹھا رکھا ہے (غرض) اس کے پاس جاؤ اور جا کر کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں، تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ رخصت کر دے اور ان کو عذاب نہ دے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی قوم کو گذشتہ ایام کی قوموں کے عروج وزوال کے حالات سے مطلع کرو اور اس طرح ان کو متنبہ کرو۔

سورہ ابراہیم میں فرمایا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝

"اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نشانیاں دیکر بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاؤ اور ان کو خدا تعالیٰ کے دن یاد دلاؤ کیونکہ ان میں ہر ایک صبر وشکر کرنے والے کے لئے نشانیاں ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اپنی کتاب "الفوز الکبیر فی اصولِ التفسیر" ص۳ میں تذکیر بایام اللہ کے یہ معنیٰ درج فرماتے ہیں: یعنی بیان وقائع کہ آں را خدا تعالیٰ ایجاد فرمودہ است از جنس انعام مطیعین وتعذیب مجرمین۔

"یعنی ان واقعات کے بیان کرنے کا حاصل مطلب یہ ہے کہ، اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبرداروں کو انعام اور نافرمانوں کو عذاب دیتا ہے۔"

سورہ یونسؑ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ (۱۰: ۸۷)

’’ہم نے موسیٰ اوران کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ مصر میں اپنے لوگوں کے رہنے کیلئے گھر بنالواوراپنے گھروں کومسجدیں قرار دواورنمازیں پڑھو اوراے موسیٰ ایمان والوں کوخوشخبری دو(کہ اب تمہاری نجات کاوقت قریب آ گیاہے۔)‘‘

ایک مردہ قوم کوزندہ کرنے کے لئے’’گذشتہ اقوام کےعروج وزوال کی تاریخ اور کامیابی کی پوری امید‘‘جوکچھ کرسکتی ہیں،اس کواس زمانہ کی اقوام نے اچھی طرح سے محسوس کرلیاہے۔

جس وقت فرعون کے ساحر،موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوگئے توفرعون نے ان سے کہا:

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ

’’ہم تمہارے ہاتھ اور پاؤں الٹے سیدھے کاٹ دیں گے اورتم سب کوسولی دیں گے۔‘‘توانہوں نے جواب دیا:

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ ’’جوکرنے والاہے کرگزر‘‘

حضرت موسیٰ علیہ السلام اوران کے ساتھی اپنے اصول اورمقصد کی تکمیل کے لئے ہر قسم کی قربانی کیلئے تیار تھے۔اس طرح انہیں کامیابی ہوئی اوران کے دشمن تباہ ہوگئے۔نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں قومی اتفاق پر بہت زوردیا ہے۔جس وقت حضرت موسیٰؑ کوہ طور پر گئے اوراپنا جانشین حضرت ہارون علیہ السلام کوکرگئے توان کی قوم میں گوسالہ پرستی شروع ہوگئی جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ حالت واپس آکردیکھی تونہایت ناراض ہوئے اورحضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا:

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِىْ ۝

’’اے ہارونؑ !جب تم نے ان کودیکھا کہ یہ لوگ گمراہ ہوگئےتم کوکیا وجہ مانع ہوئی کہ تم نے میری ہدایت کی پیروی نہ کی یاتم نے میری حکم عدولی کی،یعنی جب وہ گمراہ ہورہے تھےتوتم نے زبردستی ان کوکیوں نہ روکا؟

توحضرت ہارون علیہ السلام نے جواب دیا:

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِىْ وَلَا بِرَاْسِىْ ۚ اِنِّىْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ

’’کہا اے میرے ماں جائے بھائی!میری داڑھی اورسر کے بال نہ پکڑو۔میں اس بات سے ڈراکہ مبادا تم واپس آکر یہ کہنےلگوکہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی۔‘‘

یعنی حضرت ہارون علیہ السلام کو جب اپنی اصلاح کی کوششوں میں کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے اپنی قوم کی عارضی گمراہی کو پسند کیا،بجائے اس کے کہ آپ اس کوروکنے کے لئے ایسی پرزورکوشش کرتےجس سےقوم کےٹکڑےٹکڑے ہوجانے کااندیشہ تھا۔

ایک پیغامبر نااتفاقی کے مقابلہ میں قوم کا عارضی گمراہی میں رہنا پسند کرتا ہےاور حقیقت یہ ہے کہ جب تک قوم متفق رہتی ہےاس وقت تک تعلیم وغیرہ اثر کرکےعمدہ نتائج پیدا کرسکتی ہےاور جب نااتفاقی سےقوم کےٹکڑےٹکڑے ہوجائیں توپھروہ تباہ ہوجاتی ہے اورکسی طریقے سےکامیاب نہیں ہوتی۔

اب ظاہر ہے کہ قرآن کےایک حصے کےتو ہم نےمعنیٰ بدل دیئے،ایک حصہ ہم نے بھلادیا اورایک حصہ کی تعلیم کو ہم نے کہانیوں کا درجہ دے رکھا ہےاوراس سےہم مستفید ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔توپھرکون سی تعجب کی بات ہے کہ اب قرآن سے وہ نتیجے پیدا نہیں ہوتے جوہونے چاہئیں اورجوصحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے زمانے میں ہوچکے ہیں۔

چوتھا باب

قرآنی تعلیم کو کمزور کرنے کی منظّم سازِش

اس موقعہ پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم کے کمزور کرنے کی جو کوششیں ہوئی ہیں ان کے بارے میں امام عبدہٗ مصری کی رائے نقل کی جائے۔ علامہ موصوف اپنی کتاب ''الاسلام والنصرانیت'' میں ص ۱۱۳ پر مسلمانوں کے جمود اور اس کے اسباب کے متعلق بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''......اس کے بعد ایک خلیفہ نے سیاسی غلطی کی اور اسلامی احکام کی وسعت کے باعث اس کو اس امر کا موقعہ مل گیا، جس کو وہ اپنے خیال میں اپنے لئے بہتر سمجھتا تھا۔ اس کو خیال ہوا کہ عربی لشکر ممکن ہے کہ علوی خلیفہ کا مددگار بن جائے کیونکہ علویوں کو نبوت کے گھرانے سے زیادہ تعلق تھا۔ اس نے ترک اور ویلم وغیرہ جیسے اجنبیوں کی ایک فوج تیار کی، اس فوج کی نسبت اس کا خیال تھا کہ وہ انہیں اپنی طاقت سے فرمانبردار اور اپنے احسان سے اپنا مطیع رکھ سکے گا۔ وہ سلطنت کے باغیوں کی مدد نہ کرے گی اور جو طالب ملک ہیں ان کی مددگار نہ ہوگی اور اسلامی احکام کی وسعت اور سہولت نے اس امر کو اس کے لئے جائز رکھا اور اسلام بدل کر عجمی ہوگیا۔

ایک عباسی خیلفہ نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی ذات اور جانشینوں کے لئے بہتری پیدا کرے اس طرح پر اس نے اپنی قوم اور مذہب کے لئے برائی کی۔ اس نے اجنبیوں کی فوج میں اضافہ کیا اور عجمی سرلشکر مقرر کئے۔ صبح سے شام نہ ہونے پائی تھی کہ یہ سردارانِ لشکر خلفاء پر قابض ہوگئے اور سلطنت خلفاء کے ہاتھ سے نکل کر عجمیوں کے قبضہ میں آگئی۔ ان لوگوں کو وہ عقل نہ تھی جو اسلام سے پہنچ چکی ہو اور نہ وہ دِل تھا جو مذہب سے مہذب ہو چکا ہو۔ یہ

لوگ جہالت اور ظلم میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اسلام میں داخل ہوئے اور اسلام کو کپڑوں کی طرح اپنے جسم پر اوڑھ لیا کوئی اثر اس کا ان کے وجدان میں نہیں پہنچا۔ ان میں سے اکثر لوگ اپنے معبودوں اور بتوں کو اپنے ساتھ لائے تھے، جن کی خلوت میں پرستش کرتے اور اعلانیہ طور پر اپنا اقتدار بڑھانے کی غرض سے باجماعت نمازیں ادا کرتے۔ اس کے بعد تاتاریوں وغیرہ نے اسلام پر حملہ کیا اور بعض لوگ اس پر قابض بھی ہوگئے۔ مگر یہ تمام حملے علم کے شدید ترین حملے کے مقابلہ میں ہیچ تھے جو لوگوں کو ان کا مرتبہ بتلانے والا اور ان کے چال چلن کی خرابیوں کو ظاہر کرنے والا ہے۔

انہوں نے علم اور اس کی دولتِ اسلام پر حملہ کیا اور اپنے مددگاروں کی جماعت کو آمادہ کیا کہ وہ علماء کے زمرہ میں داخل ہو جائیں اور علم کا لباس پہن لیں اور اہلِ علم میں شمار ہونے لگیں۔ اس کے بعد عوام الناس میں ایسی مذہبی باتیں پھیلائیں کہ علم سے ان کو نفرت ہو اور طلب علم سے ان کے نفوس میں بعد پیدا ہو۔ پرہیزگاری اور مذہبی حمایت کے مدعی ہو کر یہ لوگ ان غافلوں میں داخل ہوئے اور دعویٰ کیا کہ مذہب ناقص تھا ہم اس کو کامل کرنا چاہتے ہیں یا وہ مریض تھا، ہم اس کا علاج کرتے ہیں یا منہدم ہونے والا تھا، ہم اس کو سہارا دیتے ہیں یا جھک چکا تھا، ہم اس کو سیدھا کر رہے ہیں!

انہوں نے اپنے بت پرستی کے زمانے کی رسموں کو دیکھا نیز اپنے گردوپیش کی دوسری قوموں پر نظر ڈالی اور اسلام کے لئے ایسی باتیں عاریۃً لیں، جن سے وہ بری ہے لیکن وہ عوام الناس کو مطمئن کرنے میں اس طرح کامیاب ہوئے کہ یہ شعائر اسلام کی تعظیم ہے اور ان مشائر کے محلوں اور مرکزوں پر خرافات سے بھرپور محفلیں اور میلے سجانے لگے!

انہوں نے ہمارے لئے یہ تمام محفلیں اور میلے ایجاد کئے۔ علماء اور اولیاء وغیرہ کی عبادت ہمارے لئے مقرر کی۔ جس سے اسلامی جماعت میں تفرقہ پڑ گیا اور لوگ گمراہ ہو گئے۔ انہوں نے کہہ دیا کہ متاخر کو سوائے اس کے جو متقدم کہہ چکا ہو اور کوئی بات کہنے کا حق نہیں۔ یہ امر عقائد میں داخل کر لیا گیا تاکہ فکر ساکن اور عقول منجمد ہو جائیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے مددگاروں کو اسلامی ممالک کے اطراف میں بھیجا تاکہ وہ ایسے قصوں اور خبروں اور ایسے راویوں کی اشاعت کریں جس سے عوام الناس کو اطمینان ہو جائے کہ ان کو پبلک کاموں میں غور کرنے کا کوئی حق نہیں۔

جو کام قوم اور سلطنت کے متعلق ہیں ان پر غور کرنا صرف حکام کا فرض ہے اور

دوسرے آدمیوں کو ان میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے، جو شخص ان معاملات میں دخل دیتا ہے وہ فضول ہے۔ مسلمانوں کے اعمال میں جو فساد اور ان کے حالات میں جو درہمی و برہمی پیدا ہو رہی ہے وہ حکام کے کاموں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ نتیجہ ہوتا ہے ان اخبار کا جو آخری زمانہ کی نسبت حدیثوں میں وارد ہوئے ہیں اور کسی تدبیر سے اصلاحِ حال و استقبال کی توقع نہیں ہوسکتی۔ بہتر یہ ہے کہ اس کو خدا کے سپرد کر دیا جائے۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ صرف اپنی ذاتی حالت پر اکتفاء کریں۔ احادیث کے بعض الفاظ سے ان کو اپنے اس مطلب کیلئے کچھ مدد ملے گی اور ضعیف حدیثوں اور موضوعات میں ان کو بہت سامان مل گیا جس سے ان اوہام کے پھیلانے میں ان کو بڑی تقویت ملی۔ ان گمراہ کرنے والوں کا ایک بڑا لشکر مسلمانوں میں پھیل گیا۔ شریر حاکموں اور والیوں نے تمام اطراف میں ان کی مدد کی۔ ارادوں کے پست کرنے اور ہاتھوں کو کاروبار سے روکنے کے لئے قدر کا عقیدہ ایجاد کیا گیا۔ اس خرافات کو قبول کرنے کے لئے نفوس کو آمادہ کرنے والی سب سے بڑی محرک سادہ لوحی تھی اور مذہبی امور میں ضعفِ بصیرت اور خواہشات کا اتباع، یہ ایسے امور ہیں کہ جب جمع ہو جاتے ہیں تو مہک ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح ہر حق و باطل کی تاریخی میں چھپ گیا اور انسانی نفوس میں وہ عقائد راسخ ہوگئے جو دینی اصول اور صراط مستقیم سے متضاد تھے۔ مسلمانوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی امیدیں غارت ہوئیں۔ اور ان کو مایوس کر کے بہائم کے درجہ تک پہنچا دیا۔ اس وقت جس کا نام اسلام رکھا جاتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اسلامی اعمال محض بے روح نماز، روزہ، حج کی ظاہر صورتوں کا مجموعہ ہے۔

چند اقوال ہیں جن کے معانی میں تغیر و تبدل کر لیا گیا ہے اور جن کا نتیجہ وہ بدعتیں اور خرافات ہیں جنہوں نے مسلمانوں میں اس جمود کی نوبت پہنچا دی ہے جس کو میں نے بیان کیا ہے اور انہوں نے اس کو اسلام سمجھا ہے! مسلمانوں پر اس وقت اسلام کے نام سے جو عیب لگایا جاتا ہے، اس کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسری چیز ہے جس کا نام انہوں نے اسلام رکھ لیا ہے۔ قرآن، جس کی شان یہ ہے (کہ باطل نہ تو اس کے آگے سے ہی اس کے پاس پھٹکنے پاتا ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے۔ وہ حکمت والے تعریف کئے گئے خدا کا اتارا ہوا ہے) اس بات پر شاہد ہے کہ وہ جھوٹے ہیں اور اس سے غافل ہیں اور اس کے احکام سے اعراض کرنے والے ہیں۔

پانچواں باب

مذہب۔ مسلمانوں کی ترقی کا زینہ

ہمارے مذہب کی تو یہ حالت ہے اور ہماری مذہبی تعلیم اس طریقہ سے مسموم ہو چکی ہے۔ تو پھر جب تک ہمیں صحیح مذہبی تعلیم نہ ملے ہم کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟ میرا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا سنگِ بنیاد مذہب ہے۔ بغیر مذہب کے مسلمان ترقی نہیں کر سکتے کیونکہ حقیقی قومی ترقی کیلئے جس ایثار و قربانی کی ضرورت ہے۔ اس کے سنگِ بنیاد صرف دو ہی چیزیں ہوسکتی ہیں اور تاریخ عالم شاہد ہے کہ ہمیشہ قوموں کی ترقی میں انہی دونوں سے کام لیا گیا ہے: یا تو ''مذہب'' یا ''حب وطن''۔ مذہبی جذبہ کے مقابلہ میں ''حب وطن'' کا جذبہ مسلمانوں میں بہت ہی کمزور ہے اور اس لئے مسلمان صرف مذہب سے ہی متاثر ہو کر حقیقی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ ہمارے نامور قومی مؤرخ اور شاعر (یعنی شبلی مرحوم) نے اسی مسئلہ کی توضیح کی ہے:

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو
دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں
کر دیا ذرۂ افسردہ کو ہمرنگِ شرار
ہے یہ وہ قوتِ پُر زور کہ جس کی ٹکر
سنگ خارہ کو بنادیتی ہے اک مشتِ غبار
جس کی زد کھا کے لرز جاتی ہے بنیادِ زمین
اس سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں اوراقِ دار
یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچے

کھیلنے جاتے تھے ایوان گہ کسریٰ میں شکار
وہ الٹ دیتے تھے دنیا کا مرقع دم میں
جن کے ہاتھوں میں رہا کرتی تھی اونٹوں کی بہار
اس کی برکت تھی کہ صحرائے حجازی کی سموم
بن گئی دہر میں جاکر چمن آرائے بہار
یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن
فاش کرنے لگے جبریل امیں کے اسرار
یا کوئی جذبۂ ملک وطن تھا جس نے
کردیئے دم میں قوائے علمی بیدار
ہے اسی مٹی سے سرمستی احرارِ وطن
ہے اسی نشہ سے یہ گرمیٔ ہنگامۂ کار

تجربہ بھی اس کا شاہد ہے کہ ہماری تمام قوم صرف مذہبی جذبہ سے متاثر ہوکر پوری طرح کام کرسکتی ہے۔ جب یہ حالت ہے تو یہ بات بدیہی ہے کہ قومی ترقی کے پروگرام میں سب سے اہم جزو صحیح مذہبی تعلیم ہونی چاہیئے۔ اگر صحیح مذہبی تعلیم کا انتظام نہ ہوگا تو نہ تو مسلمان اپنی ہستی قائم رکھ سکیں گے اور نہ وہ ترقی کرسکیں گے۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ اب تک ہم سے یہ بھی نہیں ہوسکا ہے کہ سرکاری سکولوں اور کالجوں میں تو کیا خود اپنے قومی سکولوں اور کالجوں میں ہی قرآنِ مجید کی تعلیم کا انتظام کرلیتے ؟!

قرآن کی تعلیم سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ بغیر مطلب سمجھے قرآن مجید کے الفاظ دہرائے جائیں۔ مسلمانوں نے قرآن کی تعلیم کا کبھی یہ مطلب نہیں سمجھا۔ بعض حضرات سے اس کا ذکر کیا گیا تو فرمایا: ہمارے طالب علموں کو یونیورسٹی کا نصاب فرصت نہیں لینے دیتا۔ میں خود اس بات کو جانتا ہوں۔ لیکن جتنا وقت، سینکڑوں مشن سکولوں اور کالجوں کے مسلمان اور ہندو طالب علم، بائیبل کیلئے دیتے ہیں کیا اتنا وقت قرآن کی تعلیم کیلئے ہمارے قومی سکولوں اور کالجوں کے طالب العم نہیں دے سکتے ؟

مشن سکولوں اور کالجوں کے طالب علم، باوجود بائیبل کے لئے عموماً روزانہ وقت دینے کے، امتحانات میں نہایت عمدہ طرح کامیاب ہوتے ہیں اور بائیبل کلاس کی وجہ سے کوئی شکایت سننے میں نہیں آتی۔ ایک تو وہ ہیں جو غیر مذہب کے طالب علموں کو روزانہ بائیبل

پڑھاتے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ اپنے ہی قومی سکولوں اور کالجوں میں قرآنِ مجید کی تعلیم کے لئے وقت نہیں نکال سکتے۔

ایک ہم کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑا
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آئی ہے

علی گڑھ کالج کے تین طالب العلم جو میرے دوست ہیں اتفاق سے سنٹرل انڈیا کے ایک مشن کالج میں تعلیم پانے کی غرض سے گئے۔ جب امتحان کا زمانہ قریب ہوا تو روزانہ اسباق بند ہوگئے تاکہ طالب علم پوری طرح سے امتحان کے لئے تیاری کرلیں لیکن بائیبل کلاس روزانہ جاری رہی۔ خود پرنسپل صاحب بائیبل پڑھاتے تھے۔ ایک روز یہ تینوں حضرات پرنسپل صاحب کے پاس گئے کہ اب امتحان بہت قریب آگیا ہے اور دوسرے تمام گھنٹوں میں سبق نہیں ہوتا ہے صرف بائیبل کلاس کی وجہ سے ہمیں کالج میں آنا پڑتا ہے۔ برائے مہربانی اس کو بھی ملتوی فرمادیجئے تاکہ پوری طرح سے امتحان کے لئے تیاری کریں، تو پرنسپل صاحب نے جواب دیا کہ ''یہ تمام عورتیں، تم سب طالب علم اور میں اور تمام پروفیسر! فقط اسی گھنٹہ کی بدولت یہاں موجود ہیں۔ اگر یہ گھنٹہ نہ ہو تو یہ کالج بھی نہ ہو۔''

اگر ہم اس واقعہ کی تقلید کرسکیں تو پھر بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ اپنے طالب علموں کو قرآنِ مجید کی تعلیم تو دی نہیں جاتی اور ستم یہ ہے کہ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ ان کے ذریعہ سے قوم کو ترقی ہو، عروج ہو، یہ ہو، وہ ہو اور اگر ان بے چاروں سے کچھ نہیں ہوسکتا تو ان پر نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں۔

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کی دامن ترمکن ہشیار باش

''ہاتھ پاؤں باندھ کر بیچ دریاہ میں پھینکنے کے بعد کہتا ہے کہ: خبردار! جو اپنا دامن تر ہونے دیا!''

سخت ضروری ہے کہ کم از کم اپنے قومی سکولوں اور کالجوں میں تو بہت جلد قرآنِ مجید کی صحیح تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ قرآنِ مجید کی تعلیم کے انتظام میں سب سے اہم حصہ عمدہ پروفیسرز کا تیار کرنا اور ان کا انتخاب ہے، اور اس بارے میں آگرہ کانفرنس ۱۹۱۳ء کے لیکچر میں، جو کانفرنس کی رپورٹ میں شائع ہوچکا ہے میں کافی بحث کرچکا ہوں۔ جب قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام ہوچکے تو اس کے بعد قومی ترقی کا نام لینا جائز ہوگا۔

خدا تعالیٰ ہمیں صحیح راستہ پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین ثم آمین۔